مقالات شرر مصباحی (حصہ دوم)

مسمیٰ بہ

تذکار

مرتب

ڈاکٹر احمد جمال مبارکپوری

ایم ڈی (یو)

نام کتاب : مقالاتِ شرر مصباحی حصۂ دوم تذکار
مصنف : ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی
پروف ریڈر : ڈاکٹر عشرت جمال
مرتب : ڈاکٹر احمد جمال
سنہ اشاعت : اپریل ۲۰۲۲ء
صفحات : ۱۱۲
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۱۴۰؍روپئے
مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرس ۱۲۳، چوڑی والان، جامع مسجد دہلی۔۶
ناشر : انجینئر منظر سعید

Book Name : **Maqalat-E-Sharar Misbahi Vol. 2 Tazkar**
~~Written by : **Dr.Fazlur Rahman Sharar Misbahi**~~
Proof Reading by : Dr. Ishrat Jamal
Compiled by : Dr. Ahmad Jamal (M.D)
Pages : 112
Published in : April 2022
Published by : Manzar Sayeed
Price : Rs. 140/-
Printed at : New India Offset Printers, Choori Walan, Jama Masjid, Delhi-6

ملنے کے پتے:
● ڈاکٹر احمد جمال، قمر ہاسپیٹل سمودھی روڈ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ
موبائل: 9795168255
● منظر سعید، پی۔ ۹۲ / اے، تھرڈ فلور اسٹریٹ نمبر ۲، بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر
اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
موبائل:9891955786
● مکتبہ امام اعظم 2 / 425 مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی نمبر ۶، موبائل:,9958423551
9958724473
● علیک بک مارٹ محلہ کٹرہ بازار، مبارک پور، اعظم گڑھ، موبائل:9450117919

عرض مرتب

والد محترم ڈاکٹر ایف. آر. مصباحی کی تصانیف میں یہ آٹھویں کتاب ہے اس سے پہلے نمود سحر، ظہور قدسی، محاسبے، معارضہ بر محاسبے کا محاسبہ، غمزۂ چشم ہمزہ، حدائق بخشش (تصحیح شدہ) کا جائزہ اور نقد و نظر شائع ہو چکی ہیں۔

مؤقر ماہنامہ جام نور دہلی کا معروف کالم "تذکار" جو والد محترم کے لیے مختص تھا یہ کتاب اسی کالم کے مضامین کا (تا صفحہ ۸۹) مجموعہ ہے۔

احباب کی خواہش پر دو اہم مضامین اور حافظ ملّت کا ایک اہم مکتوب بنام والد محترم افادۂ عام کے لیے اضافہ ہیں۔

ہمارے ریکارڈ میں ۱۹۷۱ء کے بحرانی دور کی ان تمام میٹنگوں کی منظور شدہ تجاویز محفوظ ہیں جو حاجی محمد ابراہیم دلال مرحوم (لال چوک، پرانی بستی) وغیرہ کے گھروں پر ہوئی تھیں۔ اور آخری میٹنگ کی بھی جو دار العلوم اشرفیہ گولہ بازار کی چھت پر ہوئی تھی۔

اس آخری میٹنگ میں مبارک پور کی **کمیٹی** نے (جس کا ذکر ۱۹۷۱ء کے دستور اساسی میں حافظ ملّت نے **جنرل کمیٹی** کے نام سے کیا ہے) ایک نیا عہدہ وضع کر کے حافظ ملّت کو ادارہ کا اختیار کلی دے دیا۔

اس کے علاوہ والد محترم کے نام موجودہ سربراہ اعلیٰ کے ۷ ر خطوط اور ایک اہم مکتوب حضرت محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی حفظہ اللہ تعالیٰ سابق صدر المدرسین ادارہ کا ہے جن کی اشاعت (بشرط اجازت) مستقبل قریب میں کی جائے گی۔

ہمارے لیے ذاتی طور پر یہ پیغام مسرت ہے کہ سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی درگاہِ والا جاہ سے کن فقیہاً صوفیاً ولا تکن صوفیاً فقیہاً کی مسند سعادت پر متمکن حضرت مولانا سید محمد مہدی میاں چشتی حفظہ اللہ کا ایک وقیع مضمون دستیاب ہوا ہے جسے ہم آپ کے شکریہ کے ساتھ شامل کتاب کر رہے ہیں۔

احمد جمال

۱۲/اپریل ۲۰۲۲ء

نوید دارالخیر

الحمد لولیہ والصلوٰۃ علی نبیہ۔ محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن شررؔ مصباحی شعر وسخن، عروض و بحوراور ادبیات و لسانیات کے حوالہ سے اردو دنیا کا ایک معتبر نام ہے۔ مؤقر ماہنامہ ’’جام نور دہلی‘‘ نے ڈاکٹر صاحب کو راضی کرلیا کہ وہ عظیم شخصیات سے وابستہ اپنی یادیں قلمبند کریں، جس کا اظہار انھوں نے اپنے ادارتی نوٹ میں تفصیل سے کیا ہے۔

زیر نظر کتاب دراصل ان ہی مطبوعہ مضامین کا کتابی کلکشن ہے جو ’’تذکار‘‘ کے ہی نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے (چند دیگر مشمولات کے ساتھ) ڈاکٹر مصباحی نے ان شخصیات میں اپنے استاد حافظ ملت اور قاری محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہما کے زیر عنوان بعض واقعات کی نقاب کشائی کی ہے اور اشرفیہ مبارک پور کے ایک خاص دور کی تاریخ بھی بیان کی ہے، جس کے وہ مشاہد بھی ہیں اور تجزیہ کار بھی۔ اس طرح یہ کتاب جامعہ اشرفیہ مبارکپور پر تحقیقی کام یا ریسرچ کرنے والوں کے لیے معتبر مواد کی حیثیت رکھتی ہے۔

ناچیز کو اس لیے بھی مسرت ہورہی ہے کہ مصنف کتاب کا تعلق اجمیر مقدس سے روحانی بھی ہے اور علمی بھی۔ آپ نے اشرفیہ مبارکپور میں حافظ ملت حضرت مولانا عبدالعزیز محدث مبارکپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور حافظ ملت نے صدر الشریعہ حضرت مولانا مفتی امجد علی (علیہما الرحمۃ والرضوان) کے سامنے دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر مقدس میں جہاں میرے والد کریم حضرت علامہ مفتی سید غلام علی معینی چشتی محدث اجمیری علیہ الرحمۃ شیخ الحدیث تھے۔ اس طرح مصنف کے اکتساب فیض کا سلسلۃ الذہب خواجۂ اعظم کی روحانی راجدھانی اجمیر مقدس تک بلافصل مربوط ہے۔

ڈاکٹر شرر صاحب سے ورلڈ صوفی کانفرنس ۲۰۱۶ء‘‘ کے موقع پر میرے استاد بھائی مولانا ڈاکٹر غلام عبدالقادر حبیبی صاحب کے توسط سے علما و مشائخ بورڈ دہلی کے آفس میں دو اہم ملاقاتیں ہوئیں، جن سے ڈاکٹر صاحب کی جماعتی فکرمندی، اصول پسندی اور بلند اخلاقی وغیرہ خوبیاں نکھر کر میرے مشاہدے میں آئیں۔ تحریر میں اخلاص و وفا کے ساتھ اردو ادب عالیہ کا جوہر بھی نظر آیا۔

فقیر بارگاہ چشت اہل بہشت، سرکار غریب نواز کے توسط سے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہے کہ وہ اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے اور مؤلف کے لیے اسے ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین۔

سید محمد مہدی میاں چشتی وکیل اشرفی
گدی نشین آستانۂ حضور غریب نواز
بیت النور جھالرہ درگاہ اجمیر مقدس

شرف انتساب

آقائے نعمت استاذ مشفق پیر و مرشد جلالۃ العلم حافظ ملّت حضرت مولانا حافظ عبد العزیز نور اللہ مرقدہٗ

کے نام۔

حافظ ملّت تو آن کار نمایاں کردہ ای
ذرّ ۂ بے قدر را مہر درخشاں کردہ ای
گہہ زمینے را بہ اوج آسماں بگزاشتی
گہہ فلک را پائے بوسِ تہ نشیناں کردہ ای
اول اول جمع کردی بوئے بے ترتیب را
آخر آخر آں شمیمے را پریشاں کردہ ای
ایں قدر اکرام کردی دولت علم و ہنر
ما گدایاں را تو سلطان ابن سلطاں کردہ ای

اعتراف

من هر دم خنجر را خونخوار نمی دانم
هر گوہر صافی را شہوار نمی دانم
جان ست و ہزار آفت عشق ست وہمہ راحت
من عاشق بے جانم آزار نمی دانم
یک آفتِ جانے را می دیدم و می میرم
من معنیِ "دانستن"بسیار نمی دانم
صد مدرکۂ بینش پنہاں ست در اعماقش
من دیدۂ نرگس را ناچار نمی دانم
یک یوسفِ دانش را "گویند" چہا خوب ست
من نیز خریدارم بازار نمی دانم
یک عالم خوبیہا مخفی ست در اندامش
من تحبیۂ دنیا را زنہار نمی دانم
در خلقِ خدا من ہم یک ذرۂ ہستی ام
من ذرۂ ہستی را بے کار نمی دانم
در جادۂ کاہ و گِل یک عمر گزشت اما
ایں کہکل ہستی را دیوار نمی دانم
اندیشۂ گونا گوں تنہائی من دارد
من جز غم تنہائی آزار نمی دانم
در صحبتِ آگاہاں بگزار شرؔر وقتے
ایں چیست کہ می گوئی ہر بار "نمی دانم"

فہرست مضامین

مقالات

مشمولات

حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مبارکپوری

ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

جام نور کے مسلسل اصرار کے بعد عصر حاضر کے نامور ادیب وشاعر، عالم وفاضل، محقق اور عروض داں جناب مولانا ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی عظیم شخصیات سے وابستہ اپنی یادیں قلم بند کرنے پر راضی ہو گئے ہیں- قارئین جام نور اب ''شخصیات اسلام'' کی جگہ 'تذکار' کے عنوان سے ان کا مستقل کالم پڑھیں گے اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے- ادارہ اس کے لیے ڈاکٹر صاحب کا ممنون وشکر گزار ہے- (ادارہ)

حافظ ملت حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز محدث مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ کو اہل مبارک پور ''حافظ صاحب'' کہتے تھے، قصبہ میں جب مطلقاً ''حافظ صاحب'' کہا جاتا تو آپ ہی کی ذات شریف مراد ہوتی -

یوں تو مبارک پور میں کئی قدآور ہستیاں آئیں اور دارالعلوم اشرفیہ سے کئی نامور علما وابستہ ہوئے لیکن بہ استثنائے چند ہماری زبانوں پر ان کا نام برائے نام رہ گیا ہے، لیکن حافظ ملت ایک ایسی شخصیت تھے جن کو اہل مبارک پور نے صرف دارالعلوم اشرفیہ کے شیخ الحدیث یا صدرالمدرسین کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اپنا مربی، اپنا سہارا اور اپنے دکھ درد کا مسیحا جانا- یہ وہ خصوصیت ہے جس میں آپ کا کوئی شریک وسہیم نہیں-

ماگھ کی ٹھٹھرتی رات ہو، جیٹھ کی چلچلاتی دھوپ ہو، ساون کی جھما جھم ہو، ہر موسم اور ہر حال میں ہم حافظ ملت کو اپنا دکھ درد بانٹتے ہوئے پاتے تھے- مدرسہ کے کسی خیر خواہ کا انتقال ہوا، وہ قصبہ سے دور املو، نوادہ اور سکٹھی جیسے دور دراز گاؤں کا سہی، حافظ ملت عصا لیے ہوئے پیدل چلے جا رہے ہیں- ادارہ کا کوئی ہمدرد بیمار ہوا، خبر ملی، مزاج پرسی کے لیے چل پڑے، کسی

کا مقدمہ عدالت میں درپیش ہے، کامیابی کی دعا کا طالب ہے، اس سے چنے منگوائے جارہے ہیں، اوقات درس کے بعد مدرسہ کی چھت پر صفیں لگتی ہیں، چنے کی ڈھیریاں لگادی جاتی ہیں، حافظ ملت خود بھی گھنٹوں بیٹھتے ہیں، ہمیں بھی بٹھاتے ہیں، چنے کے ایک ایک دانے پر لا الہ الا انت سبحٰنك انی کنت من الظٰلمین پڑھ پڑھ کر اس کو علاحدہ رکھا جاتا ہے- یوں اندازے سے سوا لاکھ کا آنکڑا پورا کیا جاتا ہے اور صاحب حاجت کی کامرانی کی دعا کی جاتی ہے-معمولی بخار سے لے کر لمبی بیماری تک میں یہی ایک در تھا جہاں سے اہل قصبہ کی امیدیں وابستہ تھیں- یہی وجہ ہے کہ جب حافظ ملت مبارک پور کو خیر باد کہنے والے تھے تو اہل قصبہ سکتے میں آ گئے، حواس باختہ ہو گئے، اپنی کمیوں، خامیوں اور غلطیوں کا احتساب کرنے لگے- بالآخر معلوم ہوا کہ ان پر کوئی الزام نہیں ہے بلکہ حافظ ملت جس عظیم منصوبہ کو روبہ عمل لانا چاہتے تھے اس کے لیے باہر سے کچھ رکاوٹیں ہیں- میں یہاں اس بحرانی دور اور تکلیف دہ حالات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتا- زخم کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں- قصہ مختصر اہل قصبہ نے ان رکاوٹوں کو دور کر دیا- حافظ ملت کا منصوبہ عمل میں آ گیا- چشم فلک دیکھ رہی ہے کہ کل کا دار العلوم اشرفیہ آج الجامعۃ الاشرفیہ کی شکل میں علم دین کا مہر درخشاں بن کر ساری دنیا میں اپنا اجالا پھیلا رہا ہے- ادارہ کا یہ عروج و فروغ حافظ ملت کے اخلاص اور اہل قصبہ کے پُرعزم فیصلہ پر مہر تصدیق ہے-

میں **اشرفیہ اور حافظ ملت کی تاریخ** رقم کرنے والوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اشرفیہ سے حافظ ملت تک کے تاریخی سفر پر چاہے جتنا زور قلم صرف کر لیں مبارک پور کے ایثار پیشہ مسلمانوں سے نہ تو اشرفیہ کو الگ کیا جا سکتا ہے نہ حافظ ملت کو- خدا بھلا کرے رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا جنھوں نے مبارک پور کا ''ایک تاریخی مرقع'' پیش کر کے فرض کفایہ ادا کیا ہے-شنیدہ کو دیدہ بنا دیا ہے ورنہ اب تو دار العلوم اشرفیہ اور حافظ ملت کے ذکر خیر کے ہزار دو ہزار صفحات میں بھی کہیں نہ تو رئیس قوم صدر ادارہ شیخ محمد امین انصاری کا ذکر دیکھا جاتا ہے نہ فخر قوم ناظم اعلیٰ الحاج قاضی محمد عمر کا- تا بہ دیگراں چہ رسد!

جس طرح ایک کٹورا پانی میں چٹکی بھر رنگ ڈالنے سے سارا پانی رنگین ہو جاتا ہے- اب رنگ پانی سے الگ ہے نہ پانی رنگ سے، بالکل یہی تلازمہ مبارک پور کے اہل خیر اور

حافظ ملت کی عنایات کے درمیان یا مبارک پور کے جاں نثاروں اور اشرفیہ کے مابین ہے- کاشکے اس کھلی ہوئی حقیقت اور بولتی ہوئی صداقت سے لوگ غافل نہ ہوتے اور کاشکے یہ جملہ لکھنے کا گنہگار ایک مبارک پوری کا قلم نہ ہوتا-

حافظ ملت ہمارے سرپرست بھی تھے اور ہمارے محافظ بھی- **شیخ سعدی** نے تو صرف دوستی کے معنی بتائے تھے-

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

مگر جو ہمارے تحفظ کا ذمہ اپنے سر لے چکا ہو وہ کیسا ہوگا؟ وہ ایسا ہوگا-

۱۹۵۶ کا بلاخیز سیلاب جب یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں- ٹونس ندی کا پانی آتے آتے مبارک پور کی حدود میں داخل ہو گیا، سطح آب مرتفع ہوتی رہی، ہمارا محلہ سب سے زیادہ متأثر تھا، قصبہ کے دوسرے محلوں سے ہمارا رشتہ منقطع ہو چکا تھا، صرف کشتی کے ذریعے آمد و رفت ممکن تھی، ہم لوگ روزانہ رات میں ایک نشان زدہ لکڑی ٹخنے بھر پانی میں گاڑ دیتے اور صبح کو دیکھتے کہ پانی کی سطح کتنی بلند ہوئی، روز بروز پانی بڑھتا جاتا، یہاں تک کہ گھروں کی نالیوں میں گھسنے لگا، اس عالم نفسا نفسی میں محلہ چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ لینے کی بات ہونے لگی، اگر صرف دو بالشت پانی اور اونچا ہو جاتا تو محلہ کٹرہ کے گھروں میں ہر چہار جانب سے داخل ہو جاتا، محلے میں اذان پر اذان ہونے لگی، مسجدیں نمازیوں سے بھرنے لگیں، ایسے پرخطر حالات میں جب ہم محلہ چھوڑنے پر غور کر رہے تھے یکا یک میرے غریب خانے پر حضور حافظ ملت اپنے عزیز شاگرد (مولانا) مشاہد رضا خاں ابن شیر بیشۂ اہل سنت کے ہمراہ تشریف لائے، آتے ہی شیروانی اتار کر دیوار کی کھونٹی پر ٹانگی، والد محترم سے فرمایا: ''عبد السمیع صاحب پھاوڑا لائیے'' یہ سننا تھا کہ حاضرین دہاڑیں مار کر رونے لگے، گھگھیاں بندھ گئیں، قصہ بڑا طولانی ہے- مختصر یہ کہ حافظ ملت نے محلے کا دورہ کیا، حصار کیا، پھر کشتی سے واپس تشریف لے گئے، اس کے بعد پانی کا زور ٹوٹ گیا اور ہفتہ عشرہ میں پانی ٹونس ندی کے پیٹ میں چلا گیا، اس کھلی ہوئی کرامت کا اعتراف یہاں کے غیر مسلموں نے بھی کیا تھا-

جب میں اشرفیہ میں داخلہ لینے کے بعد منشی شفقت حسین اور منشی محمد احسن وغیرہم کے درجات سے گزر کر فارسی پڑھنے مولانا سید شمس الحق گجہڑوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوا تب سے دورۂ حدیث تک میں نے یہی دیکھا کہ حافظ ملت جمعرات کے دن آخری گھنٹی میں اور کبھی کبھی چھٹی کی گھنٹی ہونے کے بعد بھی طلبہ کو اپنی درس گاہ میں بلاتے، اخلاق و کردار پر مختصر و مؤثر تقریر فرماتے اور ہفتہ بھر میں اگر کسی طالب کی کوئی شکایت مسموع ہوتی تو اس انداز سے تفہیم فرماتے کہ خاص طالب علم کو نصیحت بھی ہو جائے اور ایسی ہی غلطی کا مرتکب کوئی اور طالب علم ہو تو اس کی بھی اصلاح ہو جائے- ہاں اگر کوئی غیر معمولی شکایت ہوتی تو پھر مجرم کی خیر نہیں ہوتی-

ایک دن ایک ڈاکٹر صاحب جو بندول جیراج پور کے رہنے والے تھے، تازہ تازہ علی گڑھ طبیہ کالج سے فارغ ہو کر مبارک پور میں پریکٹس کے لیے آئے تھے- دارالعلوم اشرفیہ کی بلڈنگ کے قریب ایک ہندو حلوائی کے مکان میں کرایہ دار تھے- نیچے کلینک تھی اوپر رہائش- جب مدرسہ کی چھت پر طلبہ چہل قدمی کرتے تو ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ اپنی چھت پر صاف نظر آتے، یہ بات ڈاکٹر صاحب کو بہت لگتی تھی- ایک دن حافظ ملت کے کمرے میں آئے اور کسی قدر اہانت آمیز لہجے میں طلبہ کی شکایت کی- حافظ ملت نے کہا کہ آپ اپنی عورتوں سے کہیے پردہ کریں، پردے کا حکم عورتوں کے لیے ہے- ڈاکٹر صاحب اپنا سا منھ لے کر واپس چلے گئے لیکن حافظ ملت نے اس شکایت کا نوٹس لیا کیونکہ اس کا تعلق کردار سے تھا، لہٰذا اگلی جمعرات کی تقریر میں اسی موضوع پر نصیحت فرماتے رہے-

میں حافظ ملت کی سربراہی میں کئی ٹرم مجلس انتظامیہ کا ممبر رہا- (مجلس مشوریٰ کا رکن اب بھی ہوں) میں نے کبھی بھی حضرت کو انتظامیہ پر دباؤ ڈالتے نہیں دیکھا، ایجنڈا سامنے آتا، اراکین غور و خوض کرتے، بحث ہوتی اور جو تجویز منظور کی جاتی حافظ ملت بہ حیثیت صدر اس پر دستخط ثبت فرماتے- صرف ایک میٹنگ میں دیکھا کہ آپ نے ایجنڈا سامنے آنے کے بعد اپنی مرضی ظاہر فرما دی پھر اسی پر اراکین نے اتفاق کر لیا- یہ معاملہ مولانا عبد اللہ خاں صاحب کے تقرر اور رہائش کے لیے مکان الاٹ کرنے کا تھا- حافظ ملت نے فرمایا ''مولانا عبداللہ خاں نہایت ذی استعداد عالم ہیں- مدرسہ کو ان کی ضرورت ہے-'' یہ ایک غیر معمولی

فیصلہ تھا- اس کی نظیر اشرفیہ کی تاریخ میں نہیں ملتی-

ہماری جماعت کی پہلی کتاب ''نورالانوار'' تھی جس کو حافظ ملت سے پڑھنے کا ہمیں شرف حاصل ہوا- پہلے سبق کی عبارت میں نے ہی پڑھی تھی جس پر حافظ ملت نے دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے تھے- پھر برسوں بعد جب مجھے بہ حیثیت ممتحن مدعو کیا گیا تو مولانا نصیرالدین، مولانا اسراراحمد (موجودہ سینئر اساتذہ جامعہ اشرفیہ) کا اسی کتاب کا امتحان میں نے لیا-

حافظ ملت کا طریقہ تفہیم بڑا موثر اور دل نشیں ہوتا- وہ متن کی عبارت کو سیاق وسباق کے تناظر میں کچھ اس طرح سمجھاتے کہ گزشتہ سے پیوستہ کا ربط خود بخود ظاہر ہو جاتا- نفس مسئلہ کی توضیح وتشریح کے لیے خارجی مثالوں کا سہارا نہیں لیتے تھے بلکہ کتاب کو کتاب سے ہی سمجھنے پر زور دیتے تھے- خاص بات یہ تھی کہ آپ ہلکی آواز میں تقریر فرماتے، کان لگا کر پوری توجہ کے ساتھ تقریر سننی پڑتی - ایک دن میرے ایک ساتھی نے (غالباً مولانا ثناء المصطفیٰ نے) کہا کہ حضور دوبارہ سمجھا دیں، کچھ سنائی نہیں دیا- حضرت نے فرمایا دوبارہ تو سمجھا دوں لیکن سنائی کیوں نہیں دیا- آپ کا دھیان کہاں تھا؟ اس کے بعد بطور نصیحت فرمایا کہ آواز کا خرچ بھی حسب ضرورت ہونا چاہیے- نہ بے ضرورت ہو، نہ ضرورت سے زیادہ ہو، نہ غیر ضروری طور پر بلند ہو-

الجامعۃ الاشرفیہ کی عمارت کا نقشہ بن چکا تھا- درس گاہ کے کمروں کے مصارف کا اندازہ فی کمرہ 6000/ روپے لگایا گیا تھا- حافظ ملت نے چند اہل خیر سے رابطہ کیا- میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ درس گاہ کے کمروں کے لیے زر تعاون کی اپیل کرتے وقت حافظ ملت کی زبان میں ایسی تاثیر اور آنکھوں میں ایسی چمک ہوتی کہ کوئی معذوری ظاہر نہیں کر پاتا- ویسے تو پوری جماعت ہی ان کی عیال تھی- انھیں خوب پتا تھا کہ -/6000 روپے تعاون کے لیے کس کو متوجہ کیا جائے- ان دنوں چھ ہزار روپے بہت تھے- کچھ عقیدت مندوں نے اڑا دیا کہ جو جامعہ کو کمرہ دے گا جنت میں اس کو محل ملے گا لیکن یہ بے پر کی خبر نہیں تھی- آخرت میں اس کار خیر کی جزا سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ یہ تو خدا ورسول کی خوشنودی کا سودا تھا- کہتے ہیں کہ دن بھلے آئیں گے تو گھر پوچھتے چلے آئیں گے- معطی حضرات نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بہت کم دنوں میں ان کے کاروبار میں ایسی برکت ہوئی کہ بعض اہل خیر نے ایک ایک کمرہ اور

دینے کا اعلان کر دیا، جن کے کتبے آج بھی معطی کے اہل خاندان کے کسی فرد کے نام سے جامعہ کی درس گاہوں پر دیکھے جا سکتے ہیں-

موضع نوادہ میں حافظ ملت میرے بہنوئی حاجی منظور احمد صاحب کے یہاں تشریف لے گئے- آپ کی آمد کی خبر پہلے سے تھی- میں پہلے سے حاضر تھا- دوپہر کا کھانا کھایا گیا ،دال سبزی اور معروف گوشت کے علاوہ مچھلی اور دودھ بھی دسترخوان پر تھے، دودھ کو مچھلی نہ کھانے والوں کو پینے کی نیت سے رکھا گیا تھا، حافظ ملت نے مچھلی بھی کھائی اور دودھ بھی پیا، یہ دیکھ کر لوگ حیرت زدہ تھے، آپس میں خوب سرگوشیاں ہوئیں کیونکہ ہمارے مبارک پور میں یہ مشہور تھا کہ مچھلی اور دودھ ایک ساتھ کھانے سے سفید داغ کی بیماری پیدا ہوتی ہے- میں نے بعض کتابوں میں بھی پڑھا تھا لیکن حافظ ملت کے عمل سے ظاہر ہوا کہ یہ صحیح نہیں ہے- جب میں نے طبی کتب سے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اگر مچھلی اور دودھ کا مزاج یا ان میں سے کسی ایک کا مزاج فاسد ہو گیا ہو تو برص پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن اگر دونوں صحیح المزاج ہوں تو ان کو ایک ساتھ کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے-

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حافظ ملت نے اپنی آمد کا سبب بتایا تو حاجی منظور احمد صاحب نے فوراً -/6000 کی پیش کش منظور کر لی، حضرت نے دعائے خیر فرمائی-

چندروز کے بعد حاجی منظور احمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ میری والدہ مرحومہ کا ٹین کا ایک بکس برسوں سے کھولا نہیں گیا تھا، کل جب میں نے کھولا تو اس میں چاندی کے ڈھیر سے سکوں کے کئی ہار ملے-- -/6000 روپے سے زیادہ کے تو وہ سکے ہی ہیں، **فالحمدللہ**-

حافظ ملت متانت وسنجیدگی کی علامت تھے، بہت کم لوگوں نے انھیں ہنستے ہوئے دیکھا ہوگا، قہقہہ تو دور کی بات ہے تاہم جب ماحول میں مزاح کا نمک گھل جائے تو مسکرانا فطریات سے ہے- ایک دن فارسی کی درس گاہ میں جناب عبدالخالق محصل صاحب آئے- استاذ گرامی مولانا سید شمس الحق صاحب سے کہا کہ آپ کو حافظ صاحب یاد فرما رہے ہیں، استاذ گرامی نے اٹھتے اٹھتے کہا کہ خدا خیر کرے پھر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے، ہم میں سے کسی نے کہا کہ ایسی کیا بات ہے! استاذ محترم نے کہا مجھے کسی ناشدنی موقع پر ہی یاد کیا جاتا ہے- جانے کے تقریباً دس منٹ کے بعد مسکراتے ہوئے واپس آئے، کہنے لگے جب میں حافظ صاحب کے

یہاں گیا تو مجھے دیکھ ایک دم برس پڑے، کیا تماشا بنا رکھا ہے، آپ کے کمرے کے پاس تالیاں بجتی ہیں، آواز یہاں تک آتی ہے اور آپ کان میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں- استاذ محترم نے کہا کہ میں نے حافظ صاحب سے کہا کہ تالی کسی نے نہیں بجائی، میرے کمرے کے نیچے سیڑھی پر کچھ مزدور بیٹھے سرتی بنا رہے تھے، اس کی گرد جھاڑنے کے لیے یوں کر رہے ہیں، جس سے تالی جیسی آواز پیدا ہوگئی- ہم سے استاذ محترم نے کہا کہ میں نے جب ''یوں'' کہا تو ہتھیلی پر ہتھیلی مار کر یوں کی تشریح بھی کر دی- اس پر حافظ ملت ہنس پڑے اور مجھ سے کہا جائیے-

مولانا شمس الحق صاحب خود بھی بہت خوش مزاج تھے مزاحاً کہنے لگے ''مزدوروں نے تو تالی بجائی ہی نہیں تھی خواہ مخواہ حافظ صاحب ناراض ہو گئے، میں تو ان کے سامنے تالی بجا کر آیا ہوں'' یہ سن کر ہمیں بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی-

ہمارے دور طالب علمی میں اوپر کی جماعت کے طلبہ کرکٹ اور فٹ بال شوق سے کھیلتے تھے- (مولانا) سید کمیل اشرف (مولانا) سید اظہار اشرف وغیرہ سرکاری اسپتال کے میدان میں کرکٹ کھیلنے جاتے تھے- استاذ گرامی سید حامد اشرف صاحب کو میں نے کرکٹ کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا، لیکن دیکھتے ہوئے ضرور دیکھا، فٹ بال میں تو اشرفیہ ٹیم کا دور دور تک شہرہ تھا، مئو اسپورٹنگ کلب، فری انڈیا کلب مئو یہ دو ٹیمیں ضلع اعظم گڑھ کی بہت مضبوط ٹیمیں مانی جاتی تھیں- اشرفیہ ٹیم کا ان ٹیموں سے بڑا دلچسپ مقابلہ ہوتا تھا- زماں (گھوسی)، محمد عباس (مونگیر) مشتاق احمد و نثار احمد (مئو) یہ چند نام وہ ہیں جو اپنی اپنی پوزیشن کے ماہر پلییئر تھے- ایک بے ضابطہ ٹیم ہماری بھی تھی جس کو اس شوق فضول میں مبتلا ہونا ہوتا وہ ہماری طرف رخ کرتا- ہمارا نہ کوئی گراؤنڈ تھا نہ متعین افراد تھے (علامہ) مدنی میاں، (مولانا) محمد حنیف (مولانا) غلام حسین کے نام قابل ذکر ہیں- راقم الحروف بھی اسی ٹاٹ میں مونجھ کا بخیہ تھا- جب اشرفیہ کی فٹ بال ٹیم میچ جیت کر لوٹتی تو حافظ ملت خوش ہوتے -لیکن ناگاہ ایک دن مبارک پور کی ایک ٹیم سے اشرفیہ کی ٹیم کی بھڑنت ہوئی -مخالف ٹیم میں مبارک پور پولیس انسپکٹر کا بیٹا بھی تھا، کسی بات پر اس سے کہا سنی ہوگئی جھگڑے کی نوبت آ گئی- اس کے بعد حافظ ملت نے کھیل پر پابندی لگا دی-

مبارک پور اور اطراف میں نماز جمعہ کی اذان ثانی شروع سے ہی عندالمنبر ہوا کرتی تھی،

اسی پر مسجد راجہ مبارک شاہ میں بھی تعامل تھا- حافظ ملت بالالتزام اس جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے لگے تو آپ نے بھی اس کو باقی رکھا-شیر بیشۂ اہل سنت ایک موقع پر تشریف لائے، جمعہ کا دن تھا، آپ سے نماز جمعہ پڑھانے کی درخواست کی گئی، اس وقت بھی اذان ثانی منبر کے پاس ہوئی، لیکن اب مبارک پور کی مساجد میں یہ اذان خارج مسجد ہونے لگی ہے، اس کی ابتدا ہمارے محلہ کٹرہ کی جامع مسجد سے ہوئی-

ہوا یہ کہ محلہ کٹرہ کی جامع مسجد کی جب اولیں توسیع ہوئی تو اس کے مصلیوں نے طے کیا کہ اس توسیع شدہ جامع مسجد کی پہلی نماز جمعہ پڑھانے کے لیے حافظ ملت سے درخواست کی جائے، چنانچہ میرے والد ماجد حاجی عبد السمیع قادری صاحب (امام مسجد) اور حاجی عبدالخالق صاحب (متولی مسجد) نے حافظ ملت کی خدمت میں حاضر ہوکر مصلیان مسجد کی خواہش سے باخبر کیا، حافظ ملت جمعہ کے دن تشریف لائے اور نماز سے پہلے ایک مختصر سی تقریر اسی موضوع پر کی اور کہا کہ آج سے اذان ثانی بجائے عندالمنبر وہاں سے دی جایا کرے، آپ نے صحن مسجد کے باہر کی ایک متعینہ جگہ کی طرف اشارہ کیا، اس دن سے اذان اسی جگہ سے دی جانے لگی، نماز کے بعد محلہ میں کسی طرح کی شورش نہیں ہوئی صرف ایک عالم دین جو علامہ مدنی میاں کے ہم سبق تھے، انہوں نے ناخوشی کا اظہار کیا بلکہ اس پر معترض ہوئے کہ اگر اذان ثانی عندالمنبر جائز نہیں تھی تو اب تک کیوں ہوتی رہی اور مسجد راجہ مبارک شاہ میں اب بھی کیوں ہو رہی ہے، جس کے امام حافظ ملت ہیں اور اگر عندالمنبر جائز ہے تو پھر خارج مسجد اذان کیوں؟ غالباً حافظ ملت کے گوشۂ ذہن میں یہ بات ضرور تھی کہ اس تبدیلی کا کچھ ناخوش گوار اثر مرتب ہوسکتا ہے اس لیے انہوں نے اس کی ابتدا جامع مسجد راجہ مبارک شاہ سے نہیں کی کہ وہاں تقریباً پورے قصبے کے لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں مبادا کوئی غوغا ہو اور محلہ کٹرہ میں اہل سنت کی تعداد ٪۹۹ فیصد ہے اور سب کے سب آپ کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے ہونے والے ہیں اس لیے انہوں نے اس کی ابتدا محلہ کٹرہ سے کی- یہاں تک تو میں نے اپنے والد محترم کے ایک مکتوب کی روشنی میں تحریر کیا ہے- آج ۳۰ نومبر کو میں نے اپنے محلہ کے الحاج محمد یونس صاحب رکن مجلس شوریٰ سے فون پر بات کی، انہوں نے اتنا اضافہ کیا کہ حافظ ملت سے کچھ لوگوں نے عرض کی کہ جامع مسجد راجہ مبارک شاہ میں کیوں اذان ثانی بیرون مسجد نہیں ہوتی تو حضرت نے جواب دیا کہ وہاں بھی ہوگی- جب حافظ ملت نے دیکھا

کہ اس تبدیلی سے کوئی شورش پیدا نہیں ہوئی تو کچھ دنوں کے بعد راجہ مبارک شاہ کی مسجد میں بھی اذان ثانی خارج مسجد دی جانے لگی-

حافظ ملت کے فرزند اصغر صاحبزادہ عبدالقادر لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ میں زیر تعلیم تھے، یہ مدرسہ تجوید و قرأت کی تعلیم میں بے مثال تھا- یہ ادارہ مشہور تاجر عطر اصغر علی محمد علی کے صرف خاص سے چلتا تھا کسی طرح کی بیرونی امداد قبول نہیں کی جاتی تھی، میرے زمانۂ قیام لکھنؤ میں ابوالقاسم صاحب اس کے سربراہ تھے اور اپنے اسلاف کی روش پر قائم تھے- اسی کے احاطہ میں مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مرجع خلائق ہے اور اسی سے متصل اصغر علی محمد علی کی لال بلڈنگ ''حنا بلڈنگ'' تھی (اب نہیں ہے) چوک ایریا میں کھن کھن جی کی کوٹھی کے بعد سب سے پر شکوہ اور خوش نما کوٹھی یہی تھی- بہ قول مولانا نیاز فتح پوری یہ کوٹھی پہلے ایک طوائف کا مکان تھا، جہاں رات میں وہ زبان اور لب و لہجہ سیکھنے جاتے تھے اور دن میں مولانا عین القضاۃ کے مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرتے تھے-

ایک دن میں گھر سے (مبارک پور سے) لکھنؤ جاتے وقت حافظ ملت کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے ایک خط مفتی محمد رضا انصاری صاحب کے نام کا دیا کہ ان تک پہنچا دینا اور کلو ڈیڑھ کلو ڈھوڑی صاحبزادہ عبدالقادر کے لیے دی- میں سلام کر کے جیسے ہی دروازہ سے نکلا حضرت نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس پر (ڈھوڑی پر) آپ کا نام بھی لکھا ہوا ہے- یہ سن کر مجھے بھی ہنسی آ گئی- ظاہر ہے اس ارشاد گرامی میں اس کے سوا اور کیا راز رہا ہوگا کہ مبادا راستے میں میں ایک آدھ ڈھوڑی کھا کر جرم خیانت کا مرتکب نہ ہو جاؤں- حضرت نے اس کا دروازہ پہلے سے ہی بند کر دیا- افسوس کہ مفتی محمد رضا انصاری ان دنوں لکھنؤ میں نہیں تھے ان سے سعی بسیار کے باوجود ملاقات نہ ہو سکی اور آج بھی وہ لفافہ میرے پاس ہے-

ڈھوڑی: چاول، تل، چنسر، گڑ اور گھی وغیرہ کا مرکب ہے، یہ شکلاً کرکٹ کے گیند سے کسی قدر چھوٹی اور ٹھوس ہوتی ہے- اب برسوں سے صرف نام ہی سنا ہے، بنتے بناتے نہیں دیکھا-

حافظ ملت جب قصبہ اور مضافات کے جلسوں میں شریک ہوتے تو آپ کا معمول تھا کہ آپ سے پہلے جو مقرر جس آیۃ کریمہ کو عنوان تقریر بناتا آپ بھی اس آیۃ کریمہ کی تلاوت کر کے اسی موضوع پر خطاب فرماتے- پہلے سابق مقرر کی حوصلہ افزائی فرماتے جو نکات پسند آتے ان

کے حوالے سے خوب خوب تعریف کرتے اور پھر اپنے افادات عالیہ و اضافات غالیہ سے مجمع کو نہال کردیتے - عام طور پر قصبہ کے جلسوں میں قاری محمد یحییٰ صاحب اور علامہ ظفر ادیبی قادری صاحب کی تقریریں ہوتیں - قاری صاحب نہایت خوش الحان تھے - تقریر عام فہم ہوتی، دوران تقریر اعلیٰ حضرت کا کلام، خاص طور پر ''لم یات نظیرک فی نظر'' اور ''زمین وزماں تمہارے لیے'' جھوم جھوم کر پڑھتے، مجمع پر کیف طاری ہوجاتا، محلہ کٹرہ کے جلسوں میں ''لم یات نظیرک'' کی تو اکثر فرمائش ہوا کرتی - اس محلہ میں قاری صاحب کی سسرال تھی (قاری صاحب میرے ہمزلف تھے) علامہ ظفر قادری کی تقریر فکری اور عالمانہ ہوتی، سائنس اور اسلام آپ کا خاص موضوع ہوتا، مستشرقین کے اوہام باطلہ کا رد و ابطال پہلے عقلی دلائل سے کرتے پھر قرآن و حدیث سے ان کا ثبوت پیش کرتے - حافظ ملت کو اشرفیہ کے جن اساتذہ پر ناز تھا ان میں حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف رحمۃ اللہ علیہ کے بعد دوسرا نام آپ ہی کا تھا - (یہ میں اپنے دوران طالب علمی کی بات کررہا ہوں)۔

ضمناً عرض کرتا چلوں کہ علامہ ظفر قادری کے بارے میں جو باتیں مشہور کی گئی ہیں، یہ ۱۹۷۱ء کے بعد کی پیداوار ہیں، خاص طور پر جب مفتی شریف الحق صاحب کے فتوی دربارۂ ''کملی'' سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے ایک رسالہ کے ذریعے اپنا موقف ظاہر کیا، حافظ ملت کے زمانۂ حیات میں ان کا عقیدہ کبھی بھی معرض بحث نہیں تھا - اس ضمن میں تاریخ کی بوالعجبی ملاحظہ ہو:

> ''حیات حافظ ملت'' کے مرتب نے اشرفیہ کے ممتاز اساتذہ کی فہرست سے علامہ ظفر ادیبی قادری کا نام ہی خارج کردیا ہے، اس سے پہلے یہ نیک کام مولانا یٰسین اختر ندوی کرچکے ہیں - غالباً یہیں سے حیات حافظ ملت کے مرتب کو غذا فراہم ہوئی ہے - اس کے برخلاف حضور محدث اعظم ہند کے جانشین شیخ الاسلام علامہ مدنی میاں کی معروف تفسیر ''سید التفاسیر'' مطبوعہ ۲۰۰۸ء میں علامہ ظفر ادیبی قادری کا نام یوں مذکور ہے ''چودہ سال کی عمر میں والد بزرگوار نے دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں داخل کروایا یہاں آپ نے (مدنی میاں صاحب نے) درس نظامی کے

علاوہ عربی، فارسی، اردو کی بے شمار کتابیں پڑھیں اور اپنے استاد حضرت
حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پورا پورا
اکتساب فیض کیا، اس کے بعد اسلامی فلسفہ اور سائنس کا بھی گہرا مطالعہ
جاری رکھا، اس سلسلہ میں جامع معقولات حضرت علامہ عبد الرؤف
صاحب علیہ الرحمہ اور علامہ مظفر حسن ظفر ادیبی صاحب علیہ الرحمہ آپ
کے استاد رہے۔" (سید التفاسیر، ج:۱،ص:۵۶)

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تینوں بزرگ، یعنی مولانا بدر عالم قادری، مولانا یٰسین اختر مصباحی ندوی اور علامہ مدنی میاں، علامہ ظفر ادیبی قادری کے شاگرد ہیں اور فنون کی اہم کتابیں سبقاً سبقاً ان سے پڑھی ہیں۔

حافظ ملت **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان** کی عملی تفسیر تو تھے ہی جو لوگ اشرفیہ سے تعلق خاطر رکھتے تھے ان کے احسانات کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ شیخ محمد امین انصاری کے بعد قصبہ کی سب سے بھاری بھرکم شخصیت قاضی گھرانے کے چشم و چراغ الحاج محمد عمر انصاری (۱۹۷۵ء) کی تھی جو مدت مدید تک دار العلوم اشرفیہ کے باوقار ناظم اعلیٰ رہے۔ موصوف کی خدمات کا ذکر کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مسجد راجہ مبارک شاہ کی اولیں توسیع کا کام آپ ہی کی نگرانی میں اختتام پذیر ہوا۔ آپ صبح سے شام تک پورا وقت وہیں گزارتے۔ روزانہ دوپہر کا کھانا گھر سے جاتا، بہت گرم مزاج تھے، مبارکپور کی ٹھیٹھ بولی میں یہ قاضی گھرانا اور حاجی غلام نبی اشرفی سابق چیرمین ٹاؤن ایریا کا گھرانا گویا اردو زبان کی ٹکسالی بولی کا انیس و دبیر کا گھرانا تھا۔ مستری مزدور آپ کی ہیبت سے کانپتے تھے، آپ کے سامنے کیا مجال کہ کوئی مستری یا مزدور اپنے کام میں تساہل کرتا۔ ۱۹۷۱ء کے بحران میں شیخ محمد امین انصاری کے گھرانے کے ساتھ یہ گھرانا بھی ہمارے ناراض خیمے میں تھا۔ ۱۹۷۴ء میں حاجی صاحب سخت بیمار ہوئے۔ حافظ ملت کو اس کی خبر ہوئی تو مجھے گھر سے بلوایا (اتفاق سے میں لکھنؤ سے گھر آیا ہوا تھا) میں حاضر خدمت ہوا تو مجھے حاجی صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ساتھ چلنے کا حکم ہوا۔ چند اراکین در دولت پر پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا کہ وہاں جانا مناسب نہیں ہے، حاجی صاحب بڑے جلالی ہیں سامنا ہو تو کہیں گستاخی نہ کر بیٹھیں۔ یہ سنتے ہی

حافظ ملت نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا کہ آپ کو چند روزہ اختلاف یاد ہے اور مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب راجہ مبارک شاہ کی مسجد کی تعمیر کی نگرانی کے لیے انہوں نے خود کو وقف کر دیا تھا- یہ کہہ کر اٹھے میں ساتھ ہولیا، پورہ صوفی میں جب حاجی صاحب کے دروازے پر پہنچے تو میرے بہنوئی جناب نیاز احمد صاحب نے حافظ ملت کا استقبال کیا، میری طرف روئے سخن نہیں کیا، جب ہم گھر کے اندر پہنچے تو حاجی صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے حافظ ملت کو دیکھتے ہی اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھنے کی سکت نہیں تھی، حافظ ملت مزاج پرسی کر چکے تو حاجی صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑی، گھور کر دیکھا، پہچان لینے کے بعد ایک دم سے برس پڑے، آنکھوں میں خون اتر آیا اور اِدھر کاٹو تو لہو نہیں-

دراصل اس خفگی اور برہمی کا تعلق ۱۹۷۱ء کے بحران سے تھا- ۱۹۷۱ء میں میں حسب معمول اپنے مطب میں تھا، مولانا نصیر الدین صاحب (موجودہ سنیئر استاذ) آئے اور کہنے لگے کہ کل میں حافظ ملت کے سر کی مالش کر رہا تھا، حضرت نہ جانے کس موڈ میں تھے کہنے لگے کہ ''میں جلد ہی مبارک پور چھوڑ کر بلرام پور چلا جاؤں گا''، موصوف کی زبانی یہ خبر سنتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا، کمپاؤنڈر پر کلینک چھوڑ کر میں مولانا ممتاز احمد اشرف القادری سے ملنے ان کے گھر گیا اور اس منحوس خبر سے انہیں مطلع کیا، اسی دن ہم دونوں حقیقت حال کا پتا لگانے حافظ جی کے گھر گئے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ان سے ہی اس کی تفصیل معلوم ہو سکے گی- جب ہم نے اپنی حاضری کی وجہ بتائی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے، جھوٹ بول نہیں سکتے تھے اور سچ بولنے میں پلان چوپٹ ہونے کا اندیشہ تھا، مگر ہماری ضد پر انہیں صاف صاف کہنا پڑا کہ ہاں حافظ صاحب نے پختہ ارادہ کرلیا ہے، اب کیا تھا، میں اور مولانا اشرف القادری ادارہ کے انتظامیہ کے ممبران اور قصبہ کے بااثر حضرات سے ملتے رہے، میں اپنے نام سے مٹینگ کا ایجنڈا جاری کرتا، خود ہی کارروائی تحریر کرتا، یہاں اس کی تفصیل ذکر کرنا مقصود نہیں ہے مختصر یہ کہ قصبہ کے عوام وخواص کی سات بار میٹنگ ہوئی، ساری کارروائی میں نے نوٹ کی حتی کہ حافظ ملت نے دستور اساسی کی تمہید میں جن اجمالی اور تفصیلی دو قرار دادوں کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی راقم الحروف ہی کی ڈرافٹ کی ہوئی ہیں-

ہماری ساری پلاننگ مولانا اشرف القادری کے در دولت پر ہوا کرتی تھی- چند روز کے

بعد ہماری اس مہم میں جناب عبدالاحد صاحب اور جناب مختار احمد صاحب شامل ہو گئے۔

آمدم برسر مطلب۔ اس بحران میں حاجی محمد عمر صاحب کے گھر سے ہمارے رشتے کشیدہ ہو چکے تھے۔ آمد و رفت بند ہو چکی تھی جب حاجی صاحب سے حافظ ملت کی موجودگی میں معافی تلافی ہو گئی تو رشتے استوار ہو گئے تب یہ راز کھلا کہ حافظ ملت نے مجھے گھر سے کیوں بلوایا تھا اگر میں اس دن ساتھ میں نہ جاتا تو ہمارے درمیان کی دوری شاید کبھی دور نہ ہوتی۔

آج ۲۹ رنومبر ۲۰۰۹ء کو عیدالاضحیٰ کے دوسرے دن جب میں یہ واقعہ قلم بند کر رہا تھا اسی دوران مولانا اشرف القادری کا فون آیا انہوں نے انگلینڈ سے مبارک پور آنے کی اطلاع دی اور کہا کہ مولانا نصیرالدین صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ شرر مصباحی ۱۹۷۱ء کے واقعے کی تفصیل قلم بند کر کے شائع کر دیں ورنہ اصل واقعہ کبھی قوم کے سامنے نہیں آ سکے گا۔

حافظ ملت کا قصبہ کے غیر مسلم بھی بہت ادب کرتے تھے، جب راستے سے گزرتے تو غیر مسلم کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے حافظ ملت عصا لیے ہوئے ہاتھ تھوڑا اونچا کر لیتے گویا یہ ان کی عقیدت کا روادارانہ جواب ہوتا، حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ ہمیشہ سر جھکائے ناک کی سیدھ چلتے، دائیں بائیں کبھی سر نہیں گھماتے، لیکن نگاہیں جیسے چپ و راست پر بھی ہوتی تھیں۔

ان دنوں قصبہ میں غیر مسلموں میں دو اشخاص بڑے متمول تھے، ایک شری بدری ناتھ جن کی کوٹھی دارالعلوم اشرفیہ سے متصل جانب مغرب تھی دوسرے شری نندلال گپتا عرف منو بابو جن کا مکان مسجد راجہ مبارک شاہ سے متصل شمال مشرق میں تھا۔ بدری بابو کا گھرانا کوٹھی والے سے معروف تھا۔ مشروع وغیرہ کے بڑے آڑھتیہ تھے۔ حاجی منظور احمد دلال نوادہ کے ساتھ میں ان کے یہاں جایا کرتا تھا۔ قصبہ میں صرف انہیں کی آڑھت پر نقد خریداری ہوتی تھی۔ یہ مزاجا بالکل درجہ اول کی یونانی دوا تھے جو نفع و ضرر میں زیادہ موثر نہیں ہوتی۔ منو بابو بڑے متحرک اور فعال تھے، افسران ضلع سے تعلقات بنائے رکھتے تھے، جب ضلع مجسٹریٹ کا تبادلہ ہوتا اور اس کی جگہ دوسرا ڈی ایم چارج لیتا تو دونوں کی ایک ساتھ دعوت کرتے۔ الوداعیہ اور استقبالیہ دونوں کو ایک ساتھ نپٹاتے۔ شیخ محمد امین انصاری جو جماعت کے بھی صدر تھے اور ادارہ کے بھی، منو بابو انہیں کے سیاسی گروپ سے تعلق رکھتے تھے، یوں جماعتی امور میں حسب ضرورت ہمیں ان کا تعاون حاصل رہتا تھا بلکہ وہ خود کو ہماری

جماعت کا ایک فرد تصور کرتے تھے، حافظ ملت سے بڑی عقیدت رکھتے تھے- ایک دن میری موجودگی میں حافظ ملت کے در دولت پر حاضر ہوئے اور عرض گزار ہوئے کہ اتر پردیش کے بہت بڑے نیتا شری چرن سنگھ گھر پر آئے ہوئے ہیں، دعا لینے آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں، حافظ ملت نے فرمایا کہ میرے یہاں آنے کی تکلیف نہ کریں میں ہر اچھے آدمی کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں- یہ وہی منو بابو ہیں جنہوں نے جامعہ اشرفیہ کی حدود میں ایک بڑی اراضی خریدی تھی، زمین کا مالک کسی مسلمان کے ہاتھ اپنی زمین بیچنے کا روادار نہ تھا منو بابو نے اُسے اس نیت سے خریدا تھا کہ وہ بعد میں اشرفیہ کے نام انہیں داموں رجسٹری کر دیں گے لیکن مثل مشہور ہے کہ ''بنیا جب اٹھاتا ہے تو جھاڑو دینے لگتا ہے'' جیسے ہی جامعہ کی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا متصل اراضی کی قیمت آسمان چھونے لگی اور منو بابو کی نیت خراب ہوگئی- یہ علاحدہ ایک تکلیف دہ واقعہ ہے-شدہ شدہ معاملہ اعظم گڑھ انتظامیہ تک پہنچا ضلع کلکٹر اور کمشنر گورکھپور نے مفاہمت و مصالحت کے لیے فریقین کو مدعو کیا- اشرفیہ کے نمائندہ وفد میں قاری محمد یحییٰ صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب، محمد ابراہیم صاحب اور راقم الحروف شریک ہوتے -شاید کسی ایک میٹنگ میں مفتی عبد المنان صاحب بھی شریک تھے اور منو بابو اپنی طرف سے بنفس نفیس شریک ہوتے- ایک میٹنگ میں اپنے بھائی کو بھی ساتھ لے گئے تھے، لیکن یہ معاملہ طے نہیں ہو سکا حافظ ملت کو اس قضیہ نامرضیہ کا تادم آخر نہایت صدمہ رہا- خدا بھلا کرے مولانا عبید اللہ خاں اعظمی کا جن کی کوششوں سے جیسے تیسے معاملت طے ہوگئی اور وہ اراضی اشرفیہ کے تصرف میں آ گئی- جامعہ اشرفیہ کے صدر دروازہ (Main Gate) اور صدر بلڈنگ (Main Building) کے محاذات سے جانب جنوب جس کے جز حصے پر اس وقت حوض ہے یہی وہ اراضی ہے-

دنیا میں اگر کسی علم پر سب سے بڑا ظلم ہوا ہے اور جس کی متاع گراں ارز دن دہاڑے لوٹی گئی ہے وہ ''علم تاریخ'' ہے، اس ظلم اور زیادتی کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا جب انسان نے شعور و آگہی کی دنیا میں قدم رکھا تھا، ''محبت اور عداوت'' بہ الفاظ دیگر ''عقیدت اور نفرت'' ان دو قوموں نے ''خانوادہ حقیقت'' پر ایسا شب خون مارا ہے کہ کہیں کہیں تو غریب ''حقیقت'' کا چہرہ تک مسخ ہو گیا ہے- یہ ایک عالمی المیہ ہے، اشرفیہ کی قدیمی تاریخ کو بھی اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے-بعض تاریخ نگاروں نے جو اشرفیہ کی تاریخ رقم کی ہے اس میں جھول بھی ہے، خلا بھی

ہے اور روایت کا انقطاع بھی، اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی تاریخ محنت، لگن اور اخلاص کے ساتھ مرتب کی جائے-

قصبہ مبارک پور اپنی دینی حمیت اور مذہبی جوش وخروش میں اپنی مثال آپ رہا ہے، شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ اونٹنی پر سوار ہوکر رشد وہدایت کے لیے مبارک پور تشریف لاتے تھے، آپ کی نورانی صورت دیکھنے کے لیے پورا قصبہ امنڈ پڑتا تھا، لوگ جوق در جوق آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہوکر داخل سلسلہ ہوتے تھے پورا قصبہ اشرفیت کی جاگیر تھا حضرت مخدوم سمنانی رضی اللہ عنہ کے عرس میں حاضری کے لیے مہینہ دو مہینے پہلے سے تیاریاں کی جاتی تھیں کھانے پکانے کا سامان آٹا، دال، چاول، مسالہ، چولہا، مٹی کا تیل وغیرہ اشیائے ضروریہ کے ساتھ سیکڑوں زائرین بیل گاڑیوں میں بیٹھ کر مخدوم بابا کی درگاہ کچھوچھہ شریف کا رخ کرتے تھے، سنیت کا ہر چہار طرف بول بالا تھا، اس حقیقت کا اعتراف مکتب دیوبند کے ایک مصنف نے اپنی کتاب مقامع الحدید میں یوں کیا ہے-''ابتداء میں چونکہ یہاں کی مسلم آبادی حقیقت حال سے بالکل ناواقف تھی اس لیے قریباً تمام قصبہ ان حامیان باطل کے دام فریب میں آ گیا اور بہت جلد ان کی دکانیں چمک اٹھیں'' یہاں حامیان باطل انہیں نفوس قدسیہ کو کہا گیا ہے جنہیں ہم شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں اور سالار قافلۂ اہل سنت حضور محدث اعظم ہند کہتے ہیں- مٹھی بھر معاندین جیسے جیسے ان مشائخ کے خلاف زہر اگلتے رہے خوش عقیدہ سنیوں کی قوت ایمانی مضاعف ہوتی گئی- مولانا شکر اللہ صاحب دار العلوم دیوبند کی ہوا کھا کر تازہ دم وارد مبارک پور ہوئے تو ایک اور دُم لگ گئی، انہوں نے حضور اشرفی میاں کو مصنوعی پیر اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کو خود ساختہ مجدد کہہ کر ہوا کا رخ بدلنا چاہا مگر یہ طوفان الٹے انہیں کے لیے بلاخیز ثابت ہوا-

اِدھر سنیوں کی موجودہ دینی درس گاہ تعلیمی ضروریات کے لحاظ سے ناکافی ہوگئی تھی، رئیس قوم شیخ علیم اللہ مرحوم کے صاحبزادگان شیخ عبدالوہاب، شیخ عبدالرحمن اور شیخ عبدالواحد صاحبان نے اس کار اہم کے لیے ایک وسیع وعریض مکان واقع محلہ پرانی بستی وقف کر دیا- یہ ادارہ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم سے موسوم ہوا- حافظ ملت نے مبارک پور آنے کے بعد تعلیم وتدریس کا آغاز یہیں سے کیا- کہا جاتا ہے کہ حضرت حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قبلہ بھوجپوری رحمۃ اللہ علیہ بحکم حضرت صدر الشریعہ مولانا شاہ محمد امجد علی گھوسوی مبارک پور تشریف لائے- یہ صد فیصد صحیح ہے

لیکن یہاں ایک خلا ہے جس کو پُر کرنا ضروری ہے۔

مدرسہ اشرفیہ کی تاسیس ۱۹۰۷ء (حیات حافظ ملت کے مرتب کے مطابق) سے پہلے صدر الشریعہ سے اہل قصبہ کے رابطے کی تاریخ نہیں ملتی، دیوبندیوں نے بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں سادات کچھوچھہ کے ہی خلاف زہرافشانیاں کی ہیں، جب کہ اہل قصبہ کی کچھوچھہ مقدسہ سے والہانہ عقیدت تھی، اس لیے مدرسہ اشرفیہ اور صدر الشریعہ کے درمیان کی ایک کڑی ٹوٹی ہوئی نظر آتی ہے، یعنی مدرسہ اشرفیہ کے اراکین نے اولاً حضور اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے عرض مدعا کر کے ایک معیاری مدرس کی ضرورت کا اظہار کیا ہوگا، پھر حضور اشرفی میاں نے صدر الشریعہ سے رابطہ کیا ہوگا، یوں اہل قصبہ براہ کچھوچھہ گھوسی پہنچے ہوں گے۔

جام نور شمارہ جنوری ۲۰۱۰ منظر عام پر آیا تو میں اپنے وطن مالوف مبارک پور میں تھا۔ وہاں رسالہ پڑھا جا چکا تھا۔ اب کے قیام مبارک پور میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حاجی شبراتی صاحب ساکن محلہ پورہ خضر جو قصبہ کی مذہبی اور جماعتی سرگرمیوں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں اور جن کا شمار حافظ ملت کے جان نثاروں میں ہوتا ہے بعمر ۱۰۴ر برس پورے ہوش وحواس کے ساتھ موجود ہیں، ان سے اشرفیہ کی قدیم تاریخی معلومات حاصل کی جائیں گی، لہٰذا گھر پہنچنے کے بعد دوسرے دن ۱۹ر دسمبر ۲۰۰۹ کو مولانا اشرف القادری اور ڈاکٹر قمر الہدی انصاری ڈائریکٹر اسلامیہ ہسپتال مبارک پور کے ہمراہ آں موصوف کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ ۳ر بجے سے ساڑھے چار بجے تک ان سے مدرسہ اشرفیہ اور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے تعلق سے بیش از بیش معلومات حاصل کی گئیں۔ اس کے بعد راجہ مبارک شاہ کی مسجد میں نماز عصر پڑھنے کے بعد احاطے کی وہ جگہ دیکھنے گئے جس کی نشاندہی حاجی شبراتی صاحب نے انٹرویو میں کی تھی۔ دوسرے دن ۲۰ر دسمبر کو مولانا اشرف القادری کے ہمراہ جامعہ اشرفیہ گیا، حافظ ملت کے مزار اقدس پر حاضری دینے کے بعد اشرفیہ کی لان میں بیٹھ کر ہم دونوں کل گزشتہ کے انٹرویو کے بارے میں گفتگو کرنے لگے، اس دوران مولانا محمد احمد مصباحی صاحب کی تشریف آوری ہوئی، رسمی گفتگو کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر خالص تفہیم کے انداز میں فرمایا کہ جام نور میں آپ نے یہ جو لکھ دیا ہے کہ اہل قصبہ کی صدر الشریعہ سے رابطے کی تاریخ نہیں ملتی۔ یہ آپ نے محض ظن وتخمین سے لکھ دیا ہے جب کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد صدیق صاحب برادر کلاں صدر الشریعہ خود

مدرسہ اشرفیہ میں مدرس تھے-مولانا مصباحی کا مقصود یہ تھا کہ اس دوران گھوسی کے ایک عالم خود یہاں مدرس تھے اس لیے اہل قصبہ کو براہ کچھوچھہ گھوسی جانے کی ضرورت نہیں تھی-

مولانا مصباحی صاحب ہمارے محترم ہیں، موجودین میں جن چند اہل علم کے فضل وکمال کا اعتراف کیا جاتا ہے ان میں مولانا مصباحی بھی ہیں اس لیے ان کی بات کا وزن محسوس کیا گیا لیکن جب میں نے ان کی تفہیم کی روشنی میں اپنی تحریر پر غور کیا تو مجھے کوئی تضاد نظر نہیں آیا اور اہل قصبہ کا گھوسی سے رابطہ بواسطۂ کچھوچھہ مقدسہ پر ہی دل مطمئن رہا-

مولانا محمد صدیق صاحب کا مبارک پور آنا، کچھ دنوں کے لیے مدرسہ کا مدرس رہنا، تسلیم، لیکن ان دنوں مدرسہ کس حال میں تھا؟ بحرالعلوم سے سنیے!

''مدرسہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا، بالکل خانہ بدوشانہ انداز میں، اس مسجد سے اس دالان میں اور اس دالان سے اس برآمدے میں، اس برآمدے سے اس مکان میں اس مکان سے فلاں دکان میں منتقل ہوتا رہا اور یہی حال اس میں علما کی آمد و رفت کا بھی رہا-'' (حیات حافظ ملت صفحہ ۶۵۲)

بحرالعلوم کے ان اشعار میں بہت سے زحافات ہیں اس لیے بالکلیہ اس کی تائید نہیں کی جاسکتی کیوں کہ بیشتر اہم واقعات بغیر کسی معتبر حوالے یا متصل روایت کے تحریر کیے گئے ہیں-البتہ یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا محمد صدیق صاحب محض کچھ دنوں کے لیے مبارک پور آئے اور کسی برآمدے، دالان، یا دکان میں بچوں کو تعلیم دی لیکن جب پرانی بستی میں باضابطہ مدرسہ کا قیام ۱۹۲۲ء میں ہوا اس وقت مولانا محمد صدیق صاحب نہیں تھے، میں یہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا اگر کوئی تحریر سامنے آئی تو اس وقت کے حالات اور معیار تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے مزید وضاحت کی جائے گی- میرا مقصود یہ تھا کہ حضور صدرالشریعہ نے اپنے تاریخ ساز شاگرد حضور حافظ ملت کو مبارک پور بھیجا تو اہل قصبہ کا صدرالشریعہ سے رابطہ بواسطۂ کچھوچھہ مقدسہ ہوا، لیجیے ایک دستاویزی ثبوت بھی میرے ظن و تخمین کو مل گیا-

''یہی وہ زمانہ تھا، قصبہ کے ارباب حل وعقد کو ضرورت محسوس ہوئی کہ

مدرسہ کی تعلیمی سطح کو اور اونچا ہونا چاہیے- اس تجویز کو کمیٹی نے سرپرست مدرسہ حضرت محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کے سامنے پیش کیا اور حضرت نے فوراً اسے قبول فرمالیا اور ادارہ کے لیے ایک نئے عظیم منصب 'مربی مدرسہ' کا اضافہ فرمایا اور اس کے لیے جماعت کے سب سے بڑے عالم ماہر تعلیمات حضرت مولانا امجد علی صاحب علیہ الرحمہ کا انتخاب فرمایا اور حضرت اقدس نے بہ طیب خاطر اسے قبول فرمالیا، پھر کمیٹی کی درخواست پر حضرت ہمارے گھر رونق افروز ہوئے، اس وقت میں اپنے گھر کے صحن میں موجود تھا، میں نے دیکھا کہ حضرت کی تشریف آوری کے بعد یک لخت سناٹا چھا گیا، تمام حضرات مؤدب ہو گئے، اس وقت قصبہ کی اہم شخصیات ہمارے صحن میں موجود تھیں ان میں خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل افراد قابل ذکر ہیں- میرے ماموں شیخ محمد امین صاحب انصاری صدر مدرسہ، مولانا حکیم محمد عمر صاحب، مولوی فقیر اللہ صاحب، جناب قاری محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ، نشاۃ ثانیہ کے لیے کسی بڑے عالم کے انتخاب کے مسئلہ پر مولانا حکیم محمد عمر صاحب علیہ الرحمہ نے مربی مدرسہ کے ساتھ دیر تک گفتگو کی پھر اس کے لیے مربی مدرسہ نے استاد گرامی حضرت مولانا حافظ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ کا انتخاب فرمایا- اس طور پر حافظ ملت علیہ الرحمہ ہمارے گھر اپنے ہمراہ آنے والے طلبہ کے ساتھ قیام پذیر ہو گئے- اس وقت ہمارے لیے خورد و نوش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، اس لیے نئے طالب علم جو بھی آتے سیدھے ہمارے گھر پہنچ جاتے لیکن طلبہ کی تعداد جب کافی بڑھ گئی تو مدرسہ اشرفیہ کی بالائی منزل کی صفائی کرادی گئی اس کے بعد حافظ ملت علیہ الرحمہ طلبہ کے ساتھ وہاں منتقل ہو گئے- (پیش لفظ ''اسلام کا نظریۂ حیات و ممات''، صفحہ ۹-۱۰ مطبوعہ ۲۰۰۲ از علامہ ظفر ادیبی)

حافظ ملت کے تذکرہ میں ''حیات حافظ ملت'' پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا غالباً بے محل نہ ہوگا

کیونکہ اسی کی بعض عبارتوں سے الجھنیں پیدا ہوئی ہیں جن کی طرف مولانا محمد احمد مصباحی نے توجہ نہیں فرمائی-

میں نے شمارہ جنوری میں ''مدرسہ اشرفیہ کی تاسیس ۱۹۰۷ کے بعد قوسین میں ''حیات حافظ ملت کے مرتب کے مطابق'' لکھ دیا تھا یہ اضافہ بے مقصد نہیں تھا، اب پھر سے پوری عبارت ملاحظہ ہو جو ''تاریخ اشرفیہ ایک نظر میں'' کے جلی عنوان کے تحت درج ہے-

(۱) مدرسہ اشرفیہ (واقع محلہ پرانی بستی) کی تاسیس ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۷

(۲) حافظ ملت کی تشریف آوری (۲۹ شوال) ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۴ء (صفحہ ۶۵۵)

(الف) حیات حافظ ملت کے فاضل مرتب نے مدرسہ اشرفیہ واقع پرانی بستی کی تاسیس ۱۹۰۷ء میں بتائی ہے، اول تو تاسیس کا لفظ اپنے غیر محل میں استعمال ہوا ہے- پھر ۱۳۲۶ھ کی مطابقت ۱۹۰۷ سے غلط ہے نیز پرانی بستی میں مدرسہ اشرفیہ کی تاسیس ۱۹۰۷ میں غلط در غلط ہے- ہمارے پاس جو اشرفیہ کی پرانی روداد یں ہیں یا جو مولانا محمد احمد مصباحی صاحب نے اپنے مقالات میں جا بجا تحریر کیا ہے اس کے مطابق مدرسہ اشرفیہ کا زمانۂ قیام ۱۹۰۸ ہے- صحیح یہ ہے کہ مدرسہ اشرفیہ واقع پرانی بستی کا قیام ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۲ء میں ہوا، اب جام نور میں مطبوعہ میری تحریر کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیں میں نے کیا غلط لکھا تھا، ''مدرسہ اشرفیہ کی تاسیس ۱۹۰۷ (حیات حافظ ملت کے مرتب کے مطابق) سے پہلے صدر الشریعہ سے اہل قصبہ کے رابطے کی تاریخ نہیں ملتی، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ۱۹۰۷ سے پہلے تو مبارک پور میں مدرسہ اشرفیہ کا وجود بھی نہیں تھا اس لیے مولانا محمد صدیق علیہ الرحمہ کا بہ حیثیت مدرس یہاں آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا یہی نہیں بلکہ سن ۱۹۰۷ء میں تو حضرت صدر الشریعہ نے مدرسہ حنفیہ جون پور میں داخلہ بھی نہیں لیا تھا- دراصل میری تحریر اسی پر متفرع تھی البتہ مولانا محمد احمد مصباحی صاحب نے جو تفہیم فرمائی ہے وہ اس سے ہٹ کر ہے جس کی وضاحت دستاویزی ثبوت کے ساتھ کر دی گئی ہے-

(ب) فاضل مرتب نے حافظ ملت کی مبارک پور آمد ۲۹ شوال ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۴ء تحریر کی ہے اسی حیات حافظ ملت صفحہ نمبر ۲۷ پر حافظ ملت کی آمد ذوالقعدہ تحریر ہے اور اسی کتاب مستطاب کے صفحہ ۶۵۷ پر آپ کی آمد ماہ شعبان میں دکھائی گئی ہے- **فیاللعجب**

حیات حافظ ملت کی ترتیب وتدوین میں جن شخصیات کا عمل دخل رہا ہے اور طباعت سے پہلے جن کی نظروں سے اس کا مسودہ گزر چکا ہے ان میں بعض وہ افاضل بھی ہیں جو ماہنامہ اشرفیہ کے ''سیدین نمبر'' (۲۰۰۲) کی مجلس مشاورت کے بھی رکن تھے-''سیدین نمبر'' میں حافظ ملت کی ایک اہم تحریر شائع ہوئی ہے جو اس اعتبار سے تاریخی حیثیت کی حامل ہے کہ اس میں مدرسہ اشرفیہ کی مختصر اور جامع تاریخ ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ اس میں حافظ ملت نے اپنی آمد کے ماہ وسال کا ذکر فرما دیا ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ فاضل گرامی مولانا مبارک حسین صاحب نے اس کا عکس شائع کر دیا ہے- (اضافہ۔ یہ گرامی نامہ راقم الحروف شرر مصباحی کے نام ہے جو کتاب کے آخر میں شامل ہے)۔

اس مطبوعہ تحریر سے حیات حافظ ملت جیسے اہم اور تحقیقی پروجیکٹ پر کام کرنے والوں کی بے خبری ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی ہے، خاص طور پر مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب کی بے خبری جنھوں نے ''حیات حافظ ملت'' کے مسودہ پر نظر ثانی فرمائی ہے اور جو ''سیدین نمبر'' کی مجلس مشاورت کے رکن رہے ہیں- مبارک پور میں آپ کا قیام رہتا ہے، حیات حافظ ملت المجمع الاسلامی مبارک پور سے چھپی ہے اور سیدین نمبر شعبہ نشریات الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے شائع ہوا ہے، اس کے پیش نظر اس قرب میں اتنا بعد نا قابل فہم ہے-

حیات حافظ ملت کا مطالعہ کرنے والا سخت الجھن کا شکار ہے کہ حافظ ملت کی مبارک پور کب آمد ہوئی شعبان میں، شوال میں یا ذوالقعدہ میں؟ ایک کتاب اور تین طرح کی باتیں-

۱۹۷۱ میں دار العلوم اشرفیہ کی جنرل میٹنگ میں حافظ ملت کو تعلیمی، تنظیمی اور مالی جملہ شعبوں کا اختیار کلی دے دیا گیا تو آپ نے سب سے پہلے دار العلوم کا دستور مرتب فرمایا- آپ نے دستور سازی کا کام اپنے دست راست حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ المعروف بہ ''حافظ جی'' کو سپرد کر دیا- حافظ جی نے اس کام کے لیے کن حضرات کا تعاون حاصل کیا اس کا مجھے قطعی علم نہیں ہے گمان غالب ہے کہ اس میں حضرت علامہ ارشد القادری صاحب علیہ الرحمہ ضرور حافظ جی کے شریک کار رہے ہوں گے کیونکہ رئیس القلم ''حافظین'' کے معتمد بھی تھے اور یہ کام ان کے فکر ومزاج سے ہم آہنگ بھی تھا- قاری محمد یحیٰ صاحب علیہ الرحمہ ۱۹۶۲ سے مجلس منتظمہ کے ناظم اعلیٰ تھے، انتظامی امور میں ماہر

تھے، ان کا بھی تعاون حاصل رہا ہوگا-

غالباً جون ۱۹۷۱ میں دستور سازی کا کام مکمل ہوگیا، ایک دن میں حافظ جی کی خدمت میں حاضر ہوا- آپ نے مجھے دستور کا مسودہ دکھایا جو قاری صاحب کے خط تحریر میں تھا- میں نے اس کو از اول تا آخر پڑھنے کے بعد کچھ حذف و اضافہ کی گزارش کی جسے حافظ جی نے قبول فرمالیا اس کی قدرے تفصیل یہ ہے-

(۱) ناظم تعلیمات کے فرائض و اختیارات دفعہ ۱۷ (ج) کے تحت یہ مرقوم تھا ''تعلیمی امور میں جملہ اختلافات کے تصفیہ کے لیے اس کا فیصلہ آخری ہوگا'' میں نے عرض کیا کہ یہ شق دفعہ ۲۴ کے تحت سربراہ اعلیٰ کو جو اختیار کلی حاصل ہے اس سے متصادم ہے- حافظ جی علیہ الرحمہ نے لفظ ''آخری'' کو ''ضروری'' سے بدل دیا-

(۲) سربراہ اعلیٰ کے فرائض و اختیارات دفعہ ۲۴ (ز) کے تحت یہ عبارت تھی:

''ادارہ کے ہر قسم کے انتظامات و مالیات و تعمیرات اور ادارہ کے فلاح و بہبود کے لیے نئی اسکیمیں جاری کرنے اور قدیم شعبوں کو ترقی دینے کا مکمل اختیار ہوگا'' یہ شق یہیں ختم تھی میں نے عرض کیا کہ کبھی کبھی دستور کے الفاظ یا دفعات کے مفہوم میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اگر یہیں یا کسی اور مقام پر اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ دفعات کے مفہوم سربراہ اعلیٰ کی تشریح کے مطابق ہوگا تو ہمیشہ کے لیے اختلاف کا سد باب ہو جائے گا- میری یہ گزارش بھی مان لی گئی اور مذکورہ بالا شق (ز) کے ساتھ یہ اضافہ کیا گیا ''نیز دستور کے دفعات کے مفہوم کا تعین سربراہ اعلیٰ کی تشریح کے مطابق ہوگا''-

کچھ دنوں کے بعد حافظ ملت نے مجلس انتظامیہ کے لیے نامزد افراد حافظ جی (علیہ الرحمہ)، قاری محمد یحیٰ (علیہ الرحمہ)، مولانا محمد شفیع (علیہ الرحمہ)، مولانا عبدالمنان صاحب، حاجی عبدالستار صاحب، محمد سراج گرہست صاحب، حاجی محمد حسین صاحب، محمد ابراہیم صاحب، محمد نظام الدین صاحب اور راقم الحروف فضل الرحمن مصباحی کو انجمن اہل سنت و اشرفی دارالمطالعہ کے آفس میں بلایا- حافظ جی نے مسودہ دستور سامنے رکھا- حافظ ملت نے حافظ جی

سے فرمایا آپ نے دیکھ لیا ہے؟ حافظ جی نے ہاں میں جواب دیا، اس کے بعد ہم دس افراد نے مسودۂ دستور کے ہر ہر صفحہ پر دستخط کیے اور آخر میں حافظ ملت نے دستخط کیے- اسی کے ساتھ ''میمورنڈم آف ایسوسی ایشن'' پر بھی دستخط کیے گئے- پھر کچھ دنوں کے بعد ستمبر یا اکتوبر ۱۹۷۱ء میں دستور اساسی نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد سے چھپوایا گیا-

حافظ ملت نے جو حافظ جی سے فرمایا تھا کہ آپ نے دیکھ لیا ہے- اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے مسودہ کے سارے مندرجات پر اچھی طرح غور وخوض کر لیا ہے؟ کسی طرح کا کوئی نقص تو نہیں رہ گیا ہے؟ حافظ ملت کے اس جملے کی معنویت اس وقت سمجھ میں آئی جب دستور چھپ گیا اور حافظ ملت کی خدمت میں غالباً اکتوبر میں بھیجا گیا، یہ تعطیل کے ایام تھے، حافظ ملت نے مطبوعہ دستور کو ملاحظہ فرمانے کے بعد حافظ جی کو (یا ناظم صاحب کو) بہت سخت خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں میرے نام کے آگے پیشہ کے کالم میں ''تبلیغ'' کیوں لکھ دیا گیا ہے حافظ جی نے اس خط کو ملاحظہ فرما کر مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ قصداً کیا گیا ہے- حافظ صاحب آئیں گے تو میں ان سے بات کر لوں گا-

حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کی خبر مجھے دفتر اشرفیہ سے مرسلہ تار کے ذریعہ لکھنؤ میں ہوئی- اس مضمون کا تار غالباً انتظامیہ اور شوری کے دور دراز کے اراکین کو بھیجا گیا تھا- یہ تار ارجنٹ تھا مگر کبھی کبھی ارجنٹ تار کو آرڈینری تار سے بھی زیادہ برے دن دیکھنے پڑتے ہیں، مجھے یہ تار حضرت کی تجہیز وتکفین کے بعد ملا-

ان ایام میں آشٹانگ آیورویدک کالج لکھنؤ میں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے میں انویجیلیٹر تھا، ڈیوٹی پر جاتے ہوئے ایک حادثہ پیش آیا اس سے پہلے ایک واقعہ سن لیجیے-

دسمبر ۱۹۷۱ میں مجھے تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے سکریٹری آفس سے تار کے ذریعہ خبر ملی کہ سلیکشن کمیٹی نے مجھے منتخب کر لیا ہے، اور ورکنگ کمیٹی سے بھی منظوری حاصل ہوگئی ہے میں کسی دن بھی اپنی ڈیوٹی جوائن کر سکتا ہوں- میں نے فیصلہ کر لیا کہ یکم جنوری ۱۹۷۲ء کو ڈیوٹی جوائن کروں گا- اواخر دسمبر میں میں نے شرف بیعت و ارادت حاصل کرنے کی نیت کی، پرانے مدرسہ حضرت کی قیام گاہ پہنچا، سید کاظم پاشا جو اس وقت طالب علم تھے پرانے مدرسہ میں رہتے تھے ان سے میں نے کہا کہ حضرت کو خبر کرا دیجیے سید صاحب سے میں نے اپنی حاضری کی وجہ

بتادی تھی، حضرت کو میرے آنے کی اطلاع ہوئی تو مجھ کو بلالیا کاظم پاشا بھی میرے ساتھ تھے-
حضرت آنگن میں چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے- سید صاحب نے میرے حاضر ہونے کا سبب
بتایا، حضرت نے دعائیں دیں، کچھ ہدایات فرمائیں، داخل سلسلہ عالیہ قادریہ فرمایا، اور شجرۂ
مبارکہ پر میرا نام اور ولدیت لکھ کر عطا فرمایا، میں نے تکمیل الطب میں تقرر کی خوشخبری دی تو
حضرت بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ ایک دعا لکھ لیجیے- یہ ریل گاڑی موٹر گاڑی اور دیگر
سواریوں پر بیٹھتے وقت پڑھ لیا کیجیے گا، ناگہانی آفتوں سے بچائے گی، مجھے اچھی طرح یاد ہے
حضرت نے چار پائی کے ایک گوشے پر ہاتھ مارتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ سو فیصد کامیاب
ہے- میں نے اسی شجرہ مبارکہ پر دعا لکھ لی- اس دن سے یہ دعا ٹرین موٹر گاڑی جہاز اور کشتی
وغیرہ پر سوار ہونے سے پہلے مجھے ازخود یاد آجاتی ہے-

ہاں تو میں ۱۹۷۶ء میں حافظ ملت کے وصال کی خبر سے نڈھال تھا، دماغ مضطرب
تھا، دل بیٹھا جاتا تھا، اسی عالم میں میں سائیکل پر سوار ہو کر آشٹانگ کالج جارہا تھا، پل غلام
حسین سے کچھ ہی آگے بڑھا تھا کہ یکا یک ایک تیز رفتار موٹر سائیکل بالکل میری سیدھ میں
سامنے سے آتی نظر آئی مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا کہ اپنی سائیکل کا رخ موڑ سکوں، موٹر
سائیکل نے اتنے زور سے ٹکر ماری کہ سائیکل کا اگلا پہیہ ٹیڑھا میڑھا ہو گیا اور میں تقریباً ایک
میٹر کی دوری پر جا گرا- لیکن مجھے خراش تک نہیں آئی اور گرد جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا-
حاشیے کے لوگ موٹر سائیکل والے پر ٹوٹ پڑے اور مجھ سے یہی پوچھتے رہے کہ آپ نے
کون سی ایسی نیکی کی تھی جو آج آپ کی جان بچ گئی-

ایسا ہی ایک سانحہ الہ آباد جھوسی گھاٹ پر رونما ہوا، میں کانپور یونیورسٹی کے حکم سے الہ
آباد یونانی میڈیکل کالج کے سالانہ امتحانات کے لیے انویجیلیٹر مقرر ہوا، ڈیوٹی کے دوران
میرا قیام حضرت مولانا شاہ عزیز احمد ابوالعلائی رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت پر تھا، ایک دن
جھوسی گھاٹ حلقہ کے داروغہ کا بیٹا اوم پرکاش خانقاہ میں آیا، میں حجرے میں حیاۃ الحیوان
للدمیری کا مطالعہ کررہا تھا، شاہ صاحب نے آواز دی حکیم صاحب آپ کے شاگرد آئے ہیں
اور آپ کو اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں- میں حجرے سے باہر آیا تو اوم پرکاش نے کہا کہ پتا
جی نے آپ کو کھانے پر بلایا ہے، شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی سفارش

فرمائی - میں نے کہا کہ سید شمیم گوہر کو ساتھ کر دیجیے تو میں جانے کے لیے تیار ہوں، اوم پرکاش نے حضرت سے گزارش کی کہ گوہر صاحب سے بھی کہہ دیں حضرت نے کہا ٹھیک ہے گوہر صاحب کھائیں گے تو کیا وہ لقمہ میرے منھ میں جائے گا؟ اوم پرکاش نے کہا کہ حضور اگر کرم فرمائیں تو ہمارا نصیب جاگ جائے (یہ لڑکا فائنل بی یو ایم ایس کا اسٹوڈنٹ تھا) المختصر ہم تینوں جھوسی گھاٹ پہنچے، دریا پار کرنے کے لیے بہترین جا پانی بادبانی کشتی کا انتظام تھا، لیکن اس وقت دریا میں ہمیں اور کوئی کشتی نظر نہیں آئی - بادو باراں کے آثار ظاہر تھے گوہر صاحب نے ملاح سے کہا کہ کالے کالے بادل نظر آ رہے ہیں، ہوا بھی تیز ہوتی جا رہی ہے تو ملاح نے کہا کہ چنتا کی بات نہیں ہے بادل چھنٹ جائے گا -

ہم لوگ خدا خدا کر کے کشتی پر سوار ہوئے اور ملاح بھی تین تھے، کشتی چل پڑی، ہوا تیز ہوتی ہوگئی، کبھی شمیم گوہر مجھ سے کچھ کہتے کبھی میں ان سے مخاطب ہو کر اپنے خوف و ہراس کا اظہار کرتا - کشتی بیچ دریا میں پہنچی ہی تھی کہ طوفان آ گیا، ہوا کے تھپیڑوں سے کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگی، دریا سے موجیں اٹھتیں اور کشتی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتیں، اب وہ وقت آ گیا کہ ملاحوں نے ہاتھ کھڑے کر لیے ہم سے کہا کہ بھگوان ہی بچائے تو ہم بچ سکتے ہیں، یہ سننا تھا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے - اتنے میں ایک ملاح نے بادبانی کشتی کا ایک رسہ کھولا، جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر رسّہ کی آخری گرہ کشتی کے کڑے میں پھنس گئی یوں قدرتی طور پر بادبان کا رخ ہوا کے موافق ہو گیا پھر کشتی تقریباً ۶۰ ڈگری کے زاویے پر اس تیز رفتاری سے چلی کہ صرف پانچ منٹ میں ہم ساحل پر آ گئے جب کہ نصف دریا کا سفر تقریباً پون گھنٹے میں طے ہوا تھا۔

(ماہنامہ جام نور از دسمبر ۲۰۰۸ء تا فروری ۲۰۱۰ء)

مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی

سراپائے او چوں سراپائے او

اہل علم کہتے ہیں کہ تشبیہ کے لیے مشبہ اور مشبہ بہ میں مغائرت ہوتی ہے-اس اصول سے انکار نہیں، لیکن کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہوتے ہیں-استاذ گرامی جامع منقول ومعقول حضرت مولانا عبدالرؤف بلیاوی کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے-

یوں تو حافظ ملت کے اکثر معتقد یہ گمان کرتے تھے کہ حضرت اقدس اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ جو قلبی لگاؤ آپ کو حافظ جی سے تھا اس میں کوئی دوسرا شریک وسہیم نہیں تھا-یوں ہی جو جذبۂ سپردگی حافظ جی میں حافظ ملت کے لیے تھا، اس میں بھی آپ کا دوسرا کوئی حریف نہیں تھا-ادھر سراپا لطف وعنایت، ادھر سراپا انقیاد واطاعت-مدرسہ کا تعلیمی نظام، اساتذہ کے معاملات کا تصفیہ، طلبہ کے تنازعات کا فیصلہ، مدرسین میں تدریس کے لیے تقسیم کتب، یہ سارے اہم قلمدان آپ ہی کے پاس تھے-بڑا سے بڑا فیصلہ آپ اپنی درس گاہ میں بیٹھے بیٹھے لے لیا کرتے تھے-آپ کو یقین تھا کہ اگر یہ معاملہ حافظ ملت تک پہنچتا تو فیصلہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا-صرف ایک مثال میرے سامنے ہے، جس میں حافظ ملت کی سوچ سے حافظ جی کی سوچ الگ تھی-دونوں کا منہج فکر جدا تھا اور دونوں حق بجانب تھے-

ہوا یہ کہ ہماری جماعت کے ایک معزز خاندان کے طالب علم نے ایک دن حافظ ملت کی شان میں گستاخی کی، بھلا ہم خاموش کیسے رہ سکتے تھے-طالب علم مذکور کو پکڑ کر ہم لوگ حافظ ملت کی درس گاہ میں لے گئے-حضرت نے ہم سے کہا کیسے آئے؟ (مولانا) ثناء المصطفیٰ امجدی نے معزز صاحبزادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے آپ کی شان میں گستاخی کی ہے-حضرت نے پوچھا کیا کہا ہے؟ میں نے کہا حضور ادب مانع ہے، ہم اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتے-حضرت نے کہا کہ جب آپ بتا نہیں سکتے تو پھر یہاں کیوں آئے، جایئے-

پھر (مولانا) ثناء المصطفیٰ نے کہا کہ حضور انہوں نے آپ کے بارے میں یوں کہا ہے (طالب علم مذکور نے جو کہا تھا اس کو دہرا دیا) یہ سننا تھا کہ حافظ ملت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہمیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ شہزادے نے جو کہا ہے صحیح کہا ہے، اس میں کچھ غلط نہیں ہے- ہم حضرت اقدس کی درس گاہ سے باہر آئے تو معزز طالب علم کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، سینہ چوڑا کر کے چلنے لگے، جیسے ہی ہم مفتی عبد المنان صاحب کے کمرے سے آگے بڑھے اور حافظ جی کی درس گاہ سامنے آئی، صاحبزادے کو پکڑ کر حافظ جی کے پاس لے گئے- اب ہمارے لیے ان گستاخانہ جملوں کے دہرانے میں کوئی تکلف نہیں تھا- حافظ جی نے پوچھا کیسے آئے؟ (مولانا) ثناء المصطفیٰ نے پوری بات بتائی- حافظ جی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا- صاحبزادے سے پوچھا کیوں؟ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صحیح ہے؟ ادھر سے جواب ندارد- پھر حافظ جی نے کسی قدر کرخت لہجے میں پوچھا تو طالب علم مذکور نے اقبال جرم کر لیا- حافظ جی نے اقبالیہ الفاظ سنتے ہی کہا: جا چلا جا، صرف اس کمرے سے نہیں مدرسے سے نکل جا- اس کے بعد طالب علم مذکور کے اخراج کی باضابطہ کارروائی عمل میں لائی گئی- موصوف گھر چلے گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے سرپرست ادارہ کو اپنے اخراج کی خبر دی، یہ بھی مسموع ہوا تھا کہ سرپرست محترم نے حافظ ملت کو خط ارسال کیا تھا جس میں تحریر تھا کہ فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے، حافظ ملت نے یہ خط حافظ جی کے پاس مناسب کارروائی کے لیے بھیج دیا- حافظ جی نے سرپرست ادارہ کو واقعہ کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ مدرسہ کے نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لیے یہ اقدام ضروری تھا، اس تفصیل پر مطلع ہونے کے بعد آپ جو حکم صادر فرمائیں اس پر عمل کیا جائے گا- یہ نہیں معلوم کہ یہ خط براہ راست بھیجا گیا یا حافظ ملت کے توسط سے، مگر سرپرست محترم کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، نتیجہ کار طالب علم مذکور نے جامعہ حمیدیہ بنارس میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند فراغت حاصل کی-

یوں تو حافظ جی علیہ الرحمہ بہت دبلے پتلے تھے، ہڈیوں پر گویا گوشت پوست کا لیپ تھا، جیسے قدرت نے لحوم وشحوم کا وافر حصہ جوہر دماغ ونخاع میں شامل کر دیا ہو مگر طلبہ پر آپ کا ایسا رعب تھا کہ جب خالی اوقات میں حافظ خانے کے سامنے چارپائی پر بیٹھے پیتل کے کرہ پر نگاہیں مرکوز کیے عالم فلکیات میں گم رہتے تو طلبہ راستہ بدل کر اپنی قیام گاہ کا رخ کرتے تھے-

حافظ جی علیہ الرحمہ اساتذہ کے ذوق اور علمی صلاحیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تدریس کے لیے تقسیم کتب فرماتے- قدیم رودادیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ملت اپنے لیے خود کتابوں کا انتخاب فرماتے تھے اور ہر درجہ کی ایک کتاب اپنے پاس رکھتے تھے، اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ آپ ہر درجہ کے طلبہ کو براہ راست خود سے قریب رکھنا چاہتے تھے اور آپ کی نگاہیں ان میں جوہر قابل کی تلاش میں رہتیں-

اس وقت میرے پیش نظر ۶۲-۱۹۶۱ کا نقشہ مظہر تعلیم ہے، جس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے- مدرسین اور ان سے متعلقہ کتب کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱- جناب مولانا عبدالعزیز صاحب صدر المدرسین

بخاری شریف، جلالین شریف، توضیح تلویح، ملا حسن، شرح مأۃ عامل، نحو میر، میزان ومنشعب-

۲- جناب مولانا عبدالرؤف صاحب نائب شیخ الحدیث

مسلم شریف، تفسیر بیضاوی، صدرا، شمس بازغہ، میر زاہد ملا جلال، میر زاہد رسالہ، حکمۃ العین، شرح عقائد، مختصر المعانی، میبذی

۳- جناب مولانا مظفر حسن صاحب

ترمذی شریف، ہدایہ اولین، قاضی مبارک، حمد اللہ، امور عامہ، نور الانوار، مطول، ملا حسن

۴- جناب مولانا عبدالمنان صاحب مفتی دارالعلوم

ہدایہ اخیرین، مشکوۃ شریف، مدارک شریف، نخبۃ الفکر، قطبی مع المیر، افتاء

۵- جناب مولانا محمد شفیع صاحب

موطا امام محمد، عقائد نسفی، شرح جامی، دیوان متنبی، شرح ہدایۃ الحکمۃ، مجانی الادب، ہدایۃ الحکمۃ، شرح تہذیب، افتاء، پنج گنج، مرقات

۶- جناب مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب ناظم اعلیٰ دارالعلوم

شرح جامی، قدوری، اصول الشاشی، ازہار العرب، ہدیہ سعیدیہ، قلیوبی، نور

الایضاح، کافیہ، ہدایۃ النحو، شرح مأۃ عامل، نحو میر، فیض الادب۔

۷- جناب مولانا سید حامد اشرف صاحب

شرح وقایہ، شرح جامی، شرح تہذیب، مجانی الادب، تاریخ الخلفا، قطبی
تصدیقات، ہدیہ سعیدیہ، کافیہ، فصول اکبری، علم الصیغہ۔

اس نقشۂ مظہر تعلیم سے واضح ہے کہ حافظ ملت نے اپنے لیے کتابوں کا انتخاب خود فرمایا ہوگا، کوئی اور کرتا تو شاید صورت یہ نہ ہوتی۔

اس نقشۂ مظہر تعلیم سے ظاہر ہے کہ مدرسین پر تدریس کا بوجھ بہت زیادہ تھا- مدرسین کی قلت دور کرنے کا واحد حل تو یہی تھا کہ اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن ادارہ اس پوزیشن میں نہیں تھا- چنانچہ حافظ جی نے کسی قدر راحت کی صورت یہ پیدا کی کہ منتہی طلبہ میں سے چند افراد کا انتخاب فرماتے اور بحیثیت معین المدرسین ان سے ابتدائی درجات کی کتابیں پڑھواتے۔

۸۳-۸۲ ۱۳ھ کی روداد کے مطابق بحیثیت معین المدرسین (مولانا) ثناء المصطفیٰ ابن صدر الشریعہ علیہ الرحمہ، (مولانا) عبدالقدوس مصباحی مونگیری (موجودہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث الجامعۃ الجلالیہ العلائیہ الاشرفیہ مخدوم اشرف مشن پنڈوہ شریف) اور اس بندہ آثم فضل الرحمن مصباحی کو دارالعلوم اشرفیہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔

بایں ہمہ مصروفیات حافظ جی علیہ الرحمہ کا ایک عظیم کارنامہ فتاویٰ رضویہ حصہ سوم کی اشاعت ہے۔ یہ مجموعہ فتاویٰ ''سنی دارالاشاعت'' کی طرف سے منظر عام پر آیا- مسودہ کا حاصل کرنا، شکستہ تحریر کو پڑھنا، کرم خوردہ مقامات کے لیے سیاق وسباق کے تناظر میں اصل الفاظ کو ڈھونڈ نکالنا، اگر صرف اسی پر اکتفا کیا جائے تو یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے- پھر کتابت شدہ اوراق کی پروف ریڈنگ کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے- اس کے لیے آپ کو مولانا محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ، قاری محمد یحییٰ علیہ الرحمہ اور مولانا مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے۔

یوں تو دارالعلوم اشرفیہ کو روز اول ہی سے قوم کا اعتبار حاصل رہا ہے- مذہبی امور میں اہل قصبہ اور اطراف و جوانب کے مسلمان اشرفیہ سے رجوع کرتے، اپنے استفتا کا جواب حاصل کرتے، مولانا علی احمد صاحب، حافظ جی اور مولانا محمد شفیع صاحب سوالات کے جوابات تحریر کرتے، حافظ ملت سے تصدیق کراتے، لیکن میرے علم کے مطابق دارالافتا کے لیے باضابطہ

مفتی کی حیثیت سے مولانا عبدالمنان صاحب کا تقرر ہوا، مذکورہ بالا نقشہ مظہر تعلیم میں مولانا عبدالمنان صاحب کا نام جناب مولانا عبدالمنان صاحب مفتی دارالعلوم لکھا ہوا ہے، اس سے پہلے یہ لاحقہ کسی اور کے نام کے ساتھ میرے علم میں نہیں ہے- جب مفتی عبدالمنان صاحب کا تقرر ہوا تو آپ استفتا کا جواب تحریر فرماتے، حافظ جی اسے ملاحظہ فرماتے، جواب صحیح ہوتا تو تصدیق فرماتے- پھر یہ جواب حافظ ملت کی خدمت میں پیش ہوتا، حضرت اقدس کے 'الجواب صحیح' کے بعد فتویٰ مع استفتار جسٹر میں نقل کیا جاتا اور اصل تحریر مستفتی کے پاس بھیج دی جاتی-

یہاں میں اپنی ایک خلش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، اہل نظر غور فرمائیں:

(ا) ۶۲-۱۹۶۱ کی روداد میں سنی دارالاشاعت کا ذکر آیا ہے، جس کا قیام دارالعلوم اشرفیہ کے حوصلہ مند اساتذہ کی نگرانی میں ہوا، اسی دارالاشاعت کی طرف سے فتاویٰ رضویہ حصہ سوم کی اشاعت عمل میں آئی، چوتھی جلد کی طباعت کے انتظام کی بات بھی اس روداد میں کہی گئی ہے-

یہ رپورٹ ادارہ کے سب سے بڑے ذمہ دار شیخ محمد امین انصاری صاحب مرحوم صدر ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے- اس رپورٹ سے مستفاد ہے کہ سنی دارالاشاعت اشرفیہ کا ذیلی ادارہ تھا اس کی حیثیت المجمع الاسلامی یا المجمع المصباحی جیسے آزاد خودمختار ادارے کی نہیں تھی، سوال یہ ہے کہ حافظ جی علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد سنی دارالاشاعت کا کیا ہوا؟ اس کے کاروبار کی ذمہ داری کس کے سر آئی اور اب اس کا حساب کتاب کس کے ذمہ ہے؟ اس کے اثاثے (قرآن کریم کے سیکڑوں نسخے، فتاویٰ رضویہ کی سیکڑوں جلدیں، دیگر کتب، نقدی اور سامان) کس کی تحویل میں آئے؟

سنی دارالاشاعت کے تعلق سے دو مختلف النوع تحریریں درج کی جاتی ہیں، پہلی تحریر حضرت مولانا مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ کی ہے جو فتاویٰ رضویہ حصہ پنجم سے ماخوذ ہے اور دوسری حیات حافظ ملت سے- مؤخر الذکر کتاب پر مفتی عبدالمبین نعمانی صاحب نے نظر ثانی فرمائی ہے اور جامعہ اشرفیہ کے صدرالمدرسین مولانا محمد احمد مصباحی صاحب نے اس کی تقدیم میں اپنا تاثر یوں رقم کیا ہے:

''مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے برادر باکمال مولانا بدرالقادری نے ان سارے ہفت خوانوں کو بڑی ہنرمندی اور ذمہ داری سے سر کیا

ہے......''سوانح حافظ ملت'' میں خطابت اور شاعری سے ہٹ کر خالص تحقیقی اسلوب اپنایا ہے-'' (ص:۴۲)

(الف) فتاویٰ رضویہ حصہ پنجم میں عرض حال کے تحت بحر العلوم لکھتے ہیں:

''ان کی وفات پر پورے معاشرے کا اضطراب اور ایک وسیع خطۂ زمین میں اس سانحہ کا سوگ منایا جانا ایک فطری امر تھا، اسی لیے اہل وعیال، عزیز واقربا، حلقۂ احباب اور عام متعلقین، علماء و مدرسین، طلبہ و معتقدین کے ساتھ ساتھ مختلف ادارے اور انجمنیں جیسے انجمن اہل سنت و اشرفی دارالمطالعہ، دار العلوم اشرفیہ اور ہندوستان کے بے شمار مدارس اور تنظیموں نے اس سانحے پر اپنے دلی دکھ کا اظہار کیا اور ایصال ثواب کی مجلسیں قائم کیں- لیکن ان تمام سوگواروں کی بھیڑ میں ایک اور ادارہ بھی تھا جو کچھ نہ کر سکا، حالانکہ مولانا اس کے سب کچھ تھے اور وہ مولانا کا سب کچھ، میری مراد ''سنی دارالاشاعت'' مبارک پور اعظم گڑھ سے ہے- وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اور جن جن سے مولانا کا تعلق تھا، ادارہ ہو کہ انجمنیں، مدرسہ ہو کہ شخصیتیں ان کا اپنا علیحدہ وجود بھی تھا اور سنی دارالاشاعت کو مولانا سے الگ کر کے سوچا ہی نہیں جا سکتا، اس لیے مولانا کے بعد سنی دارالاشاعت خود بھی مر گئی، کون رہ گیا تھا جو اس کی طرف سے مولانا کا سوگ مناتا-'' (ص:۲۳، رضا اکیڈمی، ممبئی)

فتاویٰ رضویہ حصہ پنجم کی مذکورہ بالا عبارت شاید کسی دخل مقدر کا جواب ہے- ضمناً عرض ہے کہ فتاویٰ رضویہ حصہ پنجم میں مفتی عبدالمنان صاحب نے حافظ جی کا سن وصال ۱۵ھ تحریر فرمایا ہے، یہ صحیح نہیں ہے- آپ کا وصال ۱۳۹۱ (مطابق ۱۹۷۱ء) میں ہوا ہے-

(ب) اس کے برخلاف سنی دارالاشاعت کے بارے میں ''حیات حافظ ملت'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''۱۹۵۹ء میں سنی دارالاشاعت کا قیام حافظ ملت کی سرپرستی میں ہوا- عملی طور پر حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی مصباحی اس کے روح رواں

تھے اور حضرت مفتی عبدالمنان اعظمی مصباحی، حضرت قاری محمد یحییٰ مبارک پوری مصباحی، حضرت مولانا محمد شفیع اعظمی مصباحی سنی دارالاشاعت کے دست و بازو تھے- حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی مصباحی کے وصال ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء کے بعد حضرت مفتی عبدالمنان اعظمی مصباحی نے سنی دارالاشاعت کی پوری ذمہ داری سنبھالی- امام اہل سنت حضرت علامہ شاہ احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء کے فتاوی رضویہ کی اشاعت کا سہرا سنی دارالاشاعت کے سر ہے- جلد سوم سے جلد ہشتم تک فتاویٰ رضویہ کی اشاعت سنی دارالاشاعت مبارک پور ہی سے ہوئی''-(ص:۷۲۶)

اسی کتاب میں دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے:

''دین وسنیت کی تبلیغ اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کے افکار وتعلیمات نیز مسلک اعلیٰ حضرت کی اشاعت ہی کے لیے حضور حافظ ملت نور اللہ مرقدہ نے دارالعلوم اشرفیہ (مصباح العلوم) میں ۱۹۵۹ء میں شعبۂ نشر واشاعت بنام ''سنی دارالاشاعت'' قائم کیا اور اپنے تلمیذ رشید و عزیز علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا ناظم مقرر فرمایا- حافظ جی علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد حافظ ملت کے ایما پر بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ اعظمی نے اس اہم ذمہ داری کا بار گراں اپنے دوش مبارک پر اٹھالیا اور حافظ جی علیہ الرحمہ کے نقش قدم پر چل کر مابعد کی جلدوں کو نہایت عرق ریزی سے مرتب فرمانے میں مصروف رہے-''(ص:۷۴۹)

(۲)اسی روداد میں مذکور ہے:

''دارالافتا کی طرف سے ہند و بیرون ہند سے آئے ہوئے ان مذہبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں جو مسلمانوں کے مختلف مسائل حیات سے متعلق ہوتے ہیں،سوالات کی کثرت،استفتوں کی زیادتی نیز

تنوع کی وجہ سے جوابات کے ارسال میں کافی تاخیر ہوجاتی ہے-''

یہ رپورٹ بھی صدرادارہ کی طرف سے ہے:

ہندو بیرون ہند سے سوالات کا آنا، سوالات کی کثرت، استفتوں کی زیادتی جیسے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ سال بھر میں سوالات کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں رہی ہوگی اور ادارہ جیسے جیسے ترقی کرتا گیا ہوگا، نسبتاً سوالات کی تعداد بھی خاطر خواہ بڑھتی گئی ہوگی- اب اگر محض ظن وتخمین کی بنیاد پر ۶۲-۱۹۶۱اور ۹۱-۱۹۹۰کے انتیس تیس برسوں میں ہر سال کے سوالات و جوابات کا اوسط محض پانچ سو (سالانہ) فرض کیا جائے تو ان انتیس تیس برسوں میں فتاوی کی تعداد کم سے کم پندرہ ہزار ہونی چاہیے (یہ اس صورت میں ہے، جب سوالات کی مجموعی تعداد ایک ہزار سالانہ اور جوابات کی پانچ سو سالانہ فرض کی جائے)

اور ۹۱-۱۹۹۰ء کی روداد میں مذکور ہے: زبانی سوال وجواب کے علاوہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں جوابات ارسال کئے جاتے ہیں-

یہ رپورٹ آج سے یعنی ۲۰۱۰ء سے بیس برس پہلے کی ہے، اگر 'ہزاروں کی تعداد' کو علی سبیل التنز ل (Minimum) دو ہزار سالانہ فرض کیا جائے تو صرف بیس برسوں میں فتاوی کی تعداد (تا ایں دم) چالیس ہزار ہوتی ہے- اس ظن وتخمین کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ اگر سب کے سب فتاویٰ اشرفیہ یک جا کر دیے جائیں تو ان کی مجموعی تعداد کم از کم پچپن ہزار ہوگی (اس میں ۶۲-۱۹۶۱ سے پہلے کے فتاویٰ شامل نہیں ہیں) اور اگر ہر ایک استفتا اور اس کے جواب کو صرف ایک صفحہ پر کامل سمجھا جائے تو یہ صفحات کسی طور پر پچپن ہزار سے کم نہیں ہونے چاہییں، یعنی اگر ایک ہزار صفحہ پر مشتمل ایک جلد شائع کی جائے تو کم سے کم ''فتاویٰ اشرفیہ'' کی پچپن جلدیں ہوں گی-

خلش یہ ہے کہ اسی مبارک پور کے ایک دیوبندی مکتب فکر کے ادارہ احیاء العلوم سے برسوں پہلے فتاویٰ احیاء العلوم چھپ چکا ہے، فتاویٰ اشرفیہ کی طباعت واشاعت کے لیے کون سا امر مانع ہے؟

یہاں دفع دخل مقدر کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ جب کسی ملازم کا تقرر کسی خاص کام کے لیے ہوتا ہے، مثلاً ریسرچ ورک، تالیف وترجمہ وغیرہ اور اس خدمت کا اسے معاوضہ

(مشاہرہ) دیا جاتا ہے تو وہ مواد (Material) اس ملازم کی ملکیت نہیں ہوتا، سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کا یہی اصول ہے- شرع مطہر کا کیا حکم ہے، یہ مفتیان کرام مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں-

حافظ جی علیہ الرحمہ نہ شاعر تھے، نہ خطیب تھے، نہ مصنف تھے، اس لیے اکناف ہند میں وہ عوامی سطح پر معروف نہیں ہوئے، لیکن خواص اہل علم میں بہت مقبول تھے، عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اکابر علما بھی آپ کے تبحر علمی کے معترف تھے- یوں تو بلیاوی کہلاتے تھے، لیکن اشرفیہ سے متعلق ہونے کے بعد آپ نے مبارک پور کو اپنا مسکن بنایا اور یہیں کی مٹی میں آسودۂ راحت ہوئے- رمضان المبارک کی تعطیل جو کہ ۱۵ر شعبان المعظم سے ۱۰ شوال المکرم تک ہوتی تھی، حافظ جی کے دن کے اوقات مدرسہ میں گزرتے تھے- قاری محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ سفارت پر کلکتہ روانہ ہو جاتے تھے، مدرسہ کی ڈاک اور منی آرڈر وغیرہ حافظ جی اور مولانا محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ وصول کرتے تھے، ان ایام میں ہمیں حافظ جی علیہ الرحمہ سے استفادہ کا خوب خوب موقع ملتا تھا، ایک دن روزے کی حالت میں آپ نے کسی خط کا جواب تحریر فرما کر لفافہ میں بند کیا، ڈاک ٹکٹ کی گوند زبان کی نوک سے تر کر کے ٹکٹ لفافہ پر چپکا دیا، اس سے ہمیں ایک مسئلہ کا علم ہوا- انہیں ایام میں میں نے ایک دن حافظ جی سے پوچھا کہ آج کل ٹائی کا استعمال عام ہو گیا ہے، کالجوں کے لکچرر، سرکاری افسران حتیٰ کہ عصری تعلیم کے اسٹوڈنٹ عام طور پر ٹائی استعمال کرتے دیکھے جاتے ہیں، جب کہ اس کا استعمال حرام قرار دیا گیا ہے، آپ نے فرمایا کہ اب اس کا استعمال لوگ محض فیشن کے طور پر کرتے ہیں، کسی خاص قوم کا شعار نہیں رہ گیا ہے، اس لیے اس پر من تشبہ بقوم فھو منھم کے تحت حرام ہونے کا حکم نہیں دیا جائے گا، یہ غالباً ۱۹۵۹ء کی بات ہے- جب مجھے ۱۹۹۲ء میں جشن حضور مفتی اعظم ہند ممبئی میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور اسٹیج پر عین خطاب کے دوران ایک فتویٰ گشت کرتے کرتے مجھ تک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس میں ٹائی کے استعمال کے حرام ہونے کی بات کہی گئی ہے، میں نے اپنی اسی یادداشت کی بنیاد پر فتویٰ کی تحریر پر اختلافی نوٹ (Note of Descent) لگا دیا- میرے برابر میں مولانا یٰسین اختر مصباحی اور مولانا محمد ادریس بستوی بیٹھے ہوئے تھے جو میری تحریر ملاحظہ کر رہے تھے، انہوں نے بھی دستخط کرنے سے انکار کر دیا-

برسوں بعد مفتی اشرفیہ حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب سے ٹائی کے استعمال کے تعلق سے بات ہوئی تو انہوں نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ میں ٹائی کے استعمال کو حرام قرار نہیں دیتا کہ اب یہ کسی قوم کا نہ مذہبی شعار ہے نہ قومی۔

غالباً ۱۹۵۹ء کی بات ہے مولانا عامر عثمانی ایڈیٹر ''تجلی'' دیوبند نے اپنے ایک مضمون میں دعویٰ کیا تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر کا سایہ تھا (مولانا اشرف علی تھانوی سایہ کے قائل نہیں تھے۔شرر) اس کی تائید میں انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت پیش کی جس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔گرمی کا موسم اور نصف النہار کا وقت تھا فاذا انا فی ظلّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عامر عثمانی صاحب نے اس پر علمی بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جب تک حقیقت متعذر نہ ہو معنی مجازی مراد نہیں لیے جائیں گے، یہاں معنی حقیقی مراد لینے کے لیے کیا مانع ہے؟

ماہنامہ تجلی کی یہ عبارت پڑھتے ہی مجھے اپنے ایام طفولیت کی بات یاد آگئی، بڑے بوڑھے ہم سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو نمک کو زمین پر نہ گرانا ورنہ قیامت کے دن پلکوں سے اٹھانا پڑے گا اور یہ کہ مکہ مدینہ دنیا کے بیچ میں ہے۔ ان اقوال کی صحت سے یہاں بحث نہیں ہے۔تجلی کی عبارت پڑھتے ہی حافظہ میں محفوظ باتیں پردۂ خیال پر آگئیں، پھر میں نے دیکھا کہ نصف النہار کے وقت تو خود مبارک پور میں جسم کا سایہ بالشت بھر سے کم ہوتا ہے۔ مکہ مدینہ جو دنیا کا بیچ ہے، وہاں تو سایہ اور بھی کم ہوگا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ یہاں حقیقت یقیناً متعذر رہے۔اطمینان خاطر کے لیے میں حافظ جی کی خدمت میں حاضر ہوا، تجلی کی عبارت سماعت فرما کر حافظ جی مسکرائے اور مجھ سے کہا کہ جاؤ کل آنا، میں حساب لگا کر تمہیں بتادوں گا کہ مدینہ میں اس وقت گرمی کے موسم میں نصف النہار کے وقت کتنا سایہ تھا۔ دوسرے دن پہنچا تو حافظ جی نے کہا کہ ابھی حساب مکمل نہیں ہوا ہے، کل آنا۔تیسرے دن جیسے ہی درس گاہ میں قدم رکھا حافظ جی نے دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ تمہارا خیال صحیح ہے، عامر عثمانی کا دعویٰ باطل ہے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے انگشت شہادت پر (طولاً) نصفا نصف لکیر کھینچتے ہوئے کہا کہ اس وقت گرمی کے موسم میں نصف النہار کے وقت ایک نصف کے برابر سایہ تھا، اس لیے حقیقت متعذر رہے اور معنی مجازی مراد ہیں، یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے سایہ

کرم میں آ گئیں-اس وقت میں نے دیکھا کہ ڈسک کے پاس ڈھیر سی پرچیاں پڑی ہوئی ہیں-
حافظ جی جو علوم فلکیات کے ماہر تھے، انہوں نے پوری علمی دیانت کے ساتھ حساب لگا کر یہ جواب مرحمت فرمایا تھا-**فجزاھم اللہ خیر الجزاء-**

افسوس کہ حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ کے دست و پا اور قوت بازو، دارالعلوم اشرفیہ کی جان حافظ جی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۷۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہو گئے-آپ کی تدفین مبارک پور کی قدیمی قبرستان احاطہ نوگزے پیر بابا میں ہوئی- یہ وہی احاطہ ہے، جہاں شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے روح آباد (کچھوچھہ مقدسہ) سے اونٹنی پر سوار ہو کر مبارک پور قدم رنجہ فرماتے ہوئے پہلا پڑاؤ ڈالا تھا-غفر اللہ لھم و لنا اجمین

(ماہنامہ جام نور مارچ ۲۰۱۰ء)

استاذ القرا قاری محمد یحییٰ

از خون دل گزاشت بہر جانشان خویش

استاذ القرا قاری محمد یحییٰ مبارک پوری کے بغیر اشرفیہ کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی- مبارک پور میں حافظ صاحب، حافظ جی اور قاری صاحب، یہ تین خطابات، حضور حافظ ملت، حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف اور مولانا قاری محمد یحییٰ سے عبارت تھے علیہم الرحمۃ والرضوان- قاری صاحب بڑی خوبیوں کے حامل تھے، ہنس مکھ تھے، منکسر المزاج تھے، شیریں آواز تھے، خوش الحان تھے، نماز میں قراءت کے دوران کھانسی آجاتی تو الفاظ کا تار ٹوٹنے نہیں دیتے تھے، حافظ ملت کو جن چند گنے چنے افراد پر اعتماد کامل تھا، ان میں حافظ جی اور قاری صاحب کا نام علی الترتیب ہے- قاری صاحب کی انتظامی امور میں دلچسپی اور غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے آپ کو رئیس قوم الحاج محمد عمر مرحوم کے بعد ۱۹۶۲ء میں ادارہ کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا- آپ نے مولانا علی احمد مبارک پوری کے تعاون سے دفتری نظام میں زبردست اصلاحات کیں- سالانہ روداد کی ترتیب اور آنہ پائی کا حساب خود کیا کرتے تھے- آمدہ رقوم کے جوڑنے کا ان کا اپنا طریقہ تھا جو بارہا میرے مشاہدے میں آیا، وہ یہ کہ مثلاً ۱۹ کے بعد ۶ کا عدد ہے تو وہ انیس چھ پچیس کے بجائے انیس ایک بیس پانچ پچیس کہہ کر آگے بڑھتے تھے- روداد چھپوانے اکثر خود ہی سرفراز قومی پریس لکھنؤ جایا کرتے تھے- پلیٹ کی عکسی کاپی میں اگر کوئی حرف ناخواندنی ہوجاتا تو آپ کاتب کی غیر موجودگی میں خود الٹے قلم سے اس کو درست کردیتے تھے- جب میں ۱۹۶۳ء میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا تو قاری صاحب نے سرفراز پریس کے منیجر جناب انصار حسین صاحب برادر پروفیسر احتشام حسین سے میرا تعارف کرادیا تھا، اس کے بعد میرے نجی خطوط اسی پریس کی معرفت ڈاک سے آیا کرتے تھے- اس وقت میرے پیش نظر والد محترم کے لکھے ہوئے کئی پوسٹ کارڈ ہیں جن پر پتہ صرف اردو میں لکھا ہوا ہے، جو مجھے سرفراز پریس کی ڈاک میں موصول ہوئے

تھے- ان دنوں ڈاکیہ کو ضرورت بھر اردو جاننا ضروری تھا، سرفراز پریس میں ہمارے اشرفیہ کی طباعت کا کام ترجیحی بنیاد پر ہوتا تھا- برسوں بعد جب فتاویٰ رضویہ حصہ سوم کی اشاعت کا وقت آیا، اس وقت انصار حسین صاحب کے مشورہ سے لکھنؤ کے مشہور کاتب قیصر مرزا کی خدمات حاصل کی گئیں- قیصر مرزا کے بیٹے اور بہویں بھی کتابت پیشہ تھیں- فتاویٰ رضویہ حصہ سوم کی کتابت میں کہیں کہیں اہل نظر فرق محسوس کریں گے، یہ اس لیے ہے کہ بعض صفحات کی کتابت قیصر مرزا کے بیٹے یا بہو نے کی ہے- قاری صاحب فن تجوید و قراءت کے علاوہ درس نظامی کی دیگر فنون کی کتابیں بھی پڑھاتے تھے- شرح جامی کا درس راقم الحروف نے آپ ہی سے لیا تھا اور حسن اتفاق کہ برسوں بعد جب مولانا سید محمد ہاشمی کچھوچھوی دارالعلوم اشرفیہ میں شرح جامی پڑھتے تھے، راقم نے قاری صاحب ہی کی درس گاہ میں ہاشمی میاں کی جماعت کا امتحان لیا تھا اور کتاب بھی شرح جامی تھی-

یہاں میں اپنے اس کرب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض اہل قلم جو اشرفیہ کی تاریخ نگاری کے لیے قلم اٹھاتے ہیں، انہیں اشرفیہ کے عروج میں انتظامیہ کے عہدہ داروں اور اراکین کی خدمات نظر نہیں آتیں- اہل قصبہ کے ایثار و قربانی کا تذکرہ بھی محض چٹکی چندہ تک ہوتا ہے- میں ایسے قلم کاروں سے التماس کروں گا کہ وہ اشرفیہ کی حدود سے باہر آئیں، قصبہ کے گلی کوچوں میں گھومیں، اب بھی ستر اسی برس کے لوگ ملیں گے، جن سے قدیم اشرفیہ کے تدریجی ارتقا کا حال معلوم ہوگا، کم از کم اتنا کریں کہ جو خاکہ علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے مبارک پور کے تاریخی مرقع میں کھینچا تھا، اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کریں، بہت سے ایسے نام آئیں گے، جن کو ادارہ کے استحکام میں پلر (Pillar) کی حیثیت حاصل تھی، انہیں میں ایک باوقار نام قاری صاحب کا بھی ہے-

قاری صاحب کے زمانۂ نظامت کو اشرفیہ کے دور ترقی سے تعبیر کیا جانا غلط نہ ہوگا- آپ کے زمانے میں ملک کے اطراف و جوانب میں کثیر تعداد میں سفرا بھیجے گئے، ادارہ کا نام اونچا ہوتا رہا، چندے کی رقوم میں سال بہ سال اضافہ ہوتا گیا، ممبئی مولانا علی احمد مبارک پوری کی گویا جاگیر تھی اور کلکتہ خود قاری صاحب کی دولت محروسہ، یوں ممبئی اور کلکتہ کا مجموعی چندہ پورے ملک کے مجموعی چندہ سے مضاعف تھا- قاری صاحب کے توسط سے جناب حاجی محمد حفیظ اللہ صاحب

جیسے مخیر اشرفیہ کو مل گئے، جنہوں نے اس دور میں بتیس ہزار روپے کی گراں قدر رقوم سے ادارہ کی اعانت کی، جب میں لکھنؤ میں پچیس روپے ماہانہ دے کر دو پہر اور رات کا کھانا کھاتا تھا، وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ کہ روزانہ دو پہر میں بکرے کا گوشت ہوتا تھا اور ہفتہ میں ایک بار پلاؤ یا زردہ- یہ بات میں محض کرنسی کی ویلیو کے پیش نظر لکھ رہا ہوں، کیوں کہ آج بتیس ہزار روپے بڑی اہمیت نہیں رکھتے-

حافظ ملت کی حیات و خدمات پر مشتمل کتاب ''حیات حافظ ملت'' دو سال قبل المجمع الاسلامی مبارک پور سے مولانا عبدالمبین نعمانی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی ہے، قاری صاحب کے سلسلۂ ذکر میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ ''۴ر نومبر کو اشرفیہ کی کمیٹی نے ادارہ کی نظامت کے لیے نامزد کیا- آپ کی تنخواہ دوسو روپے ماہانہ مقرر ہوئی- حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اس وقت قاری صاحب سے فرمایا'' آپ کو تنخواہ دوسو روپے ملے گی، لیکن آپ سے گزارش ہے کہ اس میں سے ہر ماہ پچیس روپے ادارہ کو دے دیا کریں-'' (ص ۱۵۸)

یہ بات میں نے کبھی نہ تو قاری صاحب کی زبان سے سنی نہ اشرفیہ کے کسی ذمہ دار کے منہ سے- یہ روایت کس بزرگ کے ذریعہ حیات حافظ ملت کے مرتب تک پہنچی اور اسے مولانا عبدالمبین نعمانی نے برقرار رکھا، اس کی تحقیق کی ضرورت ہے، کیوں کہ برصدق نسبت قول ''آپ کو تنخواہ دوسو روپے ملے گی، لیکن آپ'' الخ کے بعد قاری صاحب قبض الوصول کے ذریعہ ہر ماہ دوسو روپے لیتے رہے ہوں گے اور پھر ہر ماہ پچیس روپے کی رسید حاصل کر کے اتنی رقم ادارہ کے کھاتے میں جمع کراتے رہے ہوں گے، اگر اس کی تصدیق رجسٹر قبض الوصول اور عطیہ کی رسیدوں سے ہوتی ہے فبہا-

۱۹۷۱ء میں جب اشرفیہ کا دستور مرتب ہوا، منتظمہ کمیٹی میں (راقم بھی منتظمہ کمیٹی کا رکن تھا) اس وقت قاری محمد یحییٰ علیہ الرحمہ نے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے منصوبہ کو روبہ عمل لانے میں جو قربانی پیش کی اور جس جرأت ایمانی کا مظاہرہ کیا، اسے اہل قصبہ اور اشرفیہ سے تعلق خاطر رکھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے- آپ ہی کے زمانۂ نظامت میں شعبۂ نشر و اشاعت کا قیام عمل میں آیا، جس کے لیے مجلس شوریٰ کی ایک قرار داد کے ذریعہ مبلغ دس ہزار روپے مختص کیے گئے، غالباً سب سے پہلی کتاب جو اس شعبہ سے منصۂ شہود پر آئی وہ حضور حافظ ملت کی تصنیف کردہ ''ارشاد

القرآن'' تھی- آپ ہی کے دور نظامت میں اشرفیہ میں شعبۂ تبلیغ کو بھی فروغ ہوا، مبارک پور اور ملحقہ مواضع میں اس مقصد کے لیے طلبہ اور مدرسین کے نام احکام جاری ہوئے اور دور دراز مقامات کے لیے باقاعدہ مبلغ کی حیثیت سے قاری محمد عثمان صاحب کا تقرر عمل میں آیا-

حافظ ملت مبارک پور اور ملحقہ مواضع کے جلسوں میں بالعموم قاری صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے، قاری صاحب کی قراءت اور نعت خوانی سے محفل کا رنگ دوبالا ہوجاتا تھا- عام طور پر حدائق بخشش کی معروف نعتیں ''لم یأت نظیرک''، ''وہ کمال حسن حضور ہے'' اور ''زمین وزماں تمہارے لیے'' پڑھتے تھے-

جیسا کہ حافظ ملت علیہ الرحمہ نے دستور اساسی کے پیش لفظ میں لکھا ہے دار العلوم اشرفیہ کا کوئی دستور نہیں تھا- حضرت ممدوح نے جنرل میٹنگ منعقدہ ۲۳/اپریل ۱۹۷۱ء و ۳۰/مئی ۱۹۷۱ء کی روشنی میں ادارہ کا دستور مرتب فرمایا، کمیٹی تشکیل دی اور دونوں کو گورنمنٹ سے رجسٹرڈ بھی کرادیا- اس بحرانی دور میں جماعت کا ایک طبقہ مخالف ہوگیا، لیکن یہ محض نظریاتی اختلاف تھا، ہر چند اس اختلاف سے دیوبندی گروپ نے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے-

اس بحرانی دور میں قاری صاحب اپنے فرض منصبی سے جس جرأت واخلاص کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے، یہ انہیں کا حصہ تھا- اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ حافظ ملت دار العلوم اشرفیہ کو ایک عظیم سنی یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کا خاکہ بنا چکے تھے لیکن اس کو روبہ عمل لانے میں کچھ رکاوٹیں محسوس کرتے تھے چنانچہ یکم رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ کو سرپرست ادارہ حضرت سرکار کلاں کی خدمت میں یہ عریضہ پیش کیا:

مخدوم ومحترم عظیم البرکۃ سرپرست دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور دامت برکاتہم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ!

دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے موجودہ انتظامی ڈھانچے کے متعلق اپنی بے اطمینانی کی وجہ ظاہر کر چکا ہوں اور اسی بنیاد پر میں نے سالانہ اجلاس میں اپنی علیحدگی کا اعلان کیا تھا لیکن آپ حضرات کے یقین دلانے پر کہ اشرفیہ کے مستقبل کے تحفظ کے سلسلے میں میری شکایتوں کا ازالہ فرمادیں گے میں نے مشروط طور پر اپنا فیصلہ واپس لے لیا تھا اب چوں کہ میرے فیصلے کی واپسی کا اعلان کر دیا گیا ہے، تعطیل کلاں کے بعد مجھے حسبِ دستور مدرسہ آنا ہوگا لہٰذا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو مطلع کردوں کہ ۱۰ر شوال سے پہلے مجھے عملاً مطمئن کر دیا جائے اور جیسا کہ کہہ چکا ہوں کہ جب تک مجلس انتظامیہ میں بنیادی تبدیلی نہ ہوگی میں کسی سطحی ترمیم سے مدرسہ کے مستقبل کو محفوظ نہیں سمجھوں گا اور میرے تئیں اس کی شکل صرف یہ ہے کہ ایوان بالا کی حیثیت سے مشاہیر علمائے کرام پر مشتمل گیارہ افراد کی ایک مجلس شوریٰ بنادی جائے جسے موجودہ انتظامی ڈھانچے پر ایک بااختیار نگراں اور دخیل کار کی طرح بالادستی حاصل ہو اور اس ایوان کی صدارت آپ کے ہاتھ میں ہو، یہ شکل اگر عمل میں نہیں لائی گئی تو میری شکایت بدستور باقی رہے گی اور اس کے نتیجے میں اپنی واپسی کے اعلان کا قطعاً پابند نہیں رہوں گا - ایام تعطیل کے اختتام تک آپ کے اطمینان بخش جواب کا شدت سے انتظار کروں گا - فقط عبدالعزیز عفی عنہ۔

یکم رمضان ۱۳۸۸ھ-

حافظ ملت نے اس خط میں جس بے اطمینانی کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ صدر ادارہ شیخ محمد امین انصاری (م ۱۹۶۸ء) کے انتقال کے بعد مجلس انتظامیہ کی صدارت کا مسئلہ پیش آیا - سرکار کلاں کی صدارت میں میٹنگ ہوئی، کمیٹی کے ایک معزز رکن جناب محمد ابراہیم صاحب نے ادارہ کے اس عظیم منصب کے لئے جناب اشہد حسن اشرفی کا نام پیش کیا معاً بعد مولانا محمد احمد شاہدی صاحب نے حافظ ملت کا نام پیش کر دیا یوں میٹنگ میں بدمزگی پیدا ہوگئی اور قصبہ میں بے بنیاد باتیں گشت کرنے لگیں جس سے حافظ ملت دل برداشتہ ہوئے - بالآخر انہوں نے

دستار فضیلت کے اجلاس میں اپنے مستعفی ہوجانے کا اعلان کر دیا۔

جب حافظ ملت کا گرامی نامہ سرپرست ادارہ کے پاس پہنچا تو آپ نے ۲۱ر رمضان کو یہ جواب مرحمت فرمایا:

''مکرمی ومحترمی زید الطافکم ......

علیکم السلام ثم السلام علیکم

والا نامہ تشریف لایا اور منتظمہ کے چند افراد بھی آئے چوں کہ اس سال آپ کے انداز سے اہل مبارک پور نے سمجھ لیا کہ اب آپ اپنی نوازشات سے مدرسہ کو محروم فرمانا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انتشار بھی ہے۔مختلف الخیالی بھی، لہٰذا انتظامیہ کمیٹی نے ۱۲ر شوال مقرر کر لی ہے ،اس موقع پر آپ کے شرائط کمیٹی کے سامنے رکھے جائیں گے اس کے بعد پھر صحیح نتیجہ سے مطلع کروں گا، اپنے گھر کے سب چھوٹے بڑے کو حسبِ مراتب سلام ودعا کہہ دیجیے۔سید محمد مختار اشرف ،سجادہ نشین کچھوچھہ شریف فیض آباد، ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ''

قارئین ملاحظہ فرمائیں حافظ ملت نے اپنے مکتوب میں لکھا تھا:

''ایام تعطیل کے اختتام تک آپ کے اطمینان بخش جواب کا شدت سے انتظار کروں گا''۔

اس کے جواب میں مجلس انتظامیہ کی میٹنگ کی تاریخ ایام تعطیل کے اختتام کے بعد کی مقرر کی جارہی ہے اور جس مجلس انتظامیہ میں بنیادی تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا تھا اسی مجلس انتظامیہ کے سامنے ''شرائط'' رکھی جارہی ہیں۔نتیجہ ظاہر ہے، جب حالات کی سنگینی کو سرپرست ادارہ نے محسوس کیا تو مورخہ ۶ر جنوری ۱۹۶۹ء کو آپ مبارک پور تشریف لائے ناظم اعلیٰ قاری محمد یحییٰ صاحب کو میٹنگ کے لئے ایجنڈا جاری کرنے کا حکم دیا۔ناظم صاحب نے حسبِ ذیل ایجنڈا جاری کیا۔

''(ا) حافظ ملت شیخ الحدیث صاحب دارالعلوم ہذا کے استعفا اور پھر مشروط واپسی کے نتیجے میں جماعتِ اہلِ سنت کے اندر جو ہیجانی کیفیت

پیدا ہوگئی ہے اسے دارالعلوم اشرفیہ کی ورکنگ کمیٹی انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کی قطعی رائے ہے کہ اس ہیجان خیز ماحول میں جذبات سے بالاتر ہوکر مکمل سنجیدگی سے کام نہ لیا گیا تو جماعت یقینی طور پر افتراق کا شکار ہوجائے گی جس کا لازمی اثر دارالعلوم اشرفیہ کی کارکردگی پر پڑے گا اور یہ ایسا مذہبی اور ملی نقصان ہوگا جس کی تلافی ناممکن ہوگی۔

(۲) جناب شیخ الحدیث صاحب دارالعلوم اشرفیہ نے اپنی واپسی کی جو شرط تحریر فرمائی ہے اس کے بارے میں جماعت اہلِ سنت دو حصوں میں بٹ چکی ہے اور یہ صورت حال ہمارے مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ہے اس لئے ضروری ہے کہ عوام کے سامنے کوئی ایسا حل پیش کیا جائے جس سے شیخ الحدیث حافظ ملت کی اصل شکایت بھی رفع ہوجائے اور عوام کے اندر اتحاد و اتفاق کی لہر بھی دوڑ جائے۔''

میٹنگ میں جب معزز ممبران کے سامنے یہ ایجنڈے آئے تو اتفاق رائے سے درج ذیل فیصلہ کیا گیا جس پر سرپرست ادارہ نے جو میٹنگ کی صدارت فرما رہے تھے دستخط کیے اور مہر ثبت کی۔

''حافظ ملت مولانا عبدالعزیز صاحب شیخ الحدیث مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کے استعفا نامہ سے پیدا شدہ بحرانی حالات ختم کرنے اور ایک خوشگوار فضا بنانے نیز مدرسہ اشرفیہ کے مستقبل کی آئینی بقا و استحکام کی خاطر دستوری سطح پر درج ذیل ترمیمات کی جاتی ہیں۔

(۱) یہ کہ دارالعلوم مدرسہ اشرفیہ کی ایک مجلس شوریٰ پانچ بیرونی علمائے کرام پر مشتمل ہوگی جس کا چیئر مین سرپرست مدرسہ ہوگا۔

(۲) یہ کہ مجلس منتظمہ یا جنرل کمیٹی کے اختلافی مسائل مجلس شوریٰ میں پیش کئے جائیں گے اور باہمی مشاورت کے بعد چیئر مین کا فیصلہ آخری اور ناطق سمجھا جائے گا۔

(۳) یہ کہ مجلسِ شوریٰ کے اکابر علماء کے انتخاب یا نامزدگی کا دستوری حق

صرف سرپرست مدرسہ ہذا کو ہوگا۔

(۴) یہ کہ مدرسہ اشرفیہ کا کوئی ملازم یا مدرس مجلس منتظمہ کا ممبر یا رکن نہیں ہوگا اور نہ اسے انتظامی امور میں کسی طرح کی مداخلت کا حق رہے گا۔''

جیسا کہ مذکور ہوا جنرل کمیٹی نے اتفاق رائے سے یہ تجاویز پاس کیں۔ قارئین کو معلوم ہو کہ یہ جنرل کمیٹی کوئی باضابطہ منتخب جنرل کمیٹی نہیں تھی بلکہ اس میٹنگ میں انتظامیہ کمیٹی کے اراکین، قصبہ کے بعض ذمہ دار افراد اور سرپرست صاحب کے ہمراہ آئے ہوئے بزرگوار شریک تھے۔ اس میٹنگ کے دوسرے دن یعنی ۷ رجنوری ۱۹۶۹ء کو سرپرست ادارہ نے اپنی صدارت میں درج ذیل پانچ اکابر علما پر مشتمل مجلس شوریٰ تشکیل دی۔

مولانا سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی، مولانا عبد الرشید خاں ناگ پوری، مولانا محمد یونس صاحب مرادآبادی، مولانا قاضی شمس الدین صاحب جونپوری، مولانا محمد سلیمان صاحب بھاگل پوری اور ناظم اعلیٰ کو ہدایت دی کہ ان حضرات کو میٹنگ کی کارروائی سے باخبر کردیا جائے لیکن یہ ساری کارروائی ایک طرح کی خانہ پری ثابت ہوئی یعنی ۷ رجنوری ۱۹۶۹ء کی میٹنگ کے بعد اپریل ۱۹۷۱ء تک اس مجلس شوریٰ کی نہ کوئی میٹنگ ہوئی نہ ادارہ کی کھوج خبر لی گئی۔ نتیجہ کار حافظ ملت کی شکایت بدستور باقی رہی اور مبارک پور کو خیرباد کہنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

جیسے ہی قصبہ میں حافظ ملت کے مبارک پور چھوڑ کر جانے کی خبر پھیلی عوام وخواص دم بخود رہ گئے۔ اور جیسا کہ میں ''تذکار'' میں حافظ ملت کے سلسلہ ذکر میں تحریر کرچکا ہوں ایک وقت آیا جب قصبہ اور مضافات کے سنی عوام نے حافظ ملت کو ادارہ کے تعلیمی تنظیمی اور مالی جملہ شعبوں کا مکمل اختیار دے دیا جب یہ خبر کچھوچھہ پہنچی تو سرکار کلاں مبارک پور تشریف لائے آپ کے ساتھ آپ کی مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی اور جناب سید حسن مثنیٰ انور بھی آئے۔

اشرفیہ کے صدر دفتر میں ناظم اعلیٰ اور مولانا علی احمد صاحب نے استقبال کیا بیٹھتے ہی مثنیٰ میاں صاحب نے قاری صاحب سے کہا کہ ناظم صاحب ایجنڈا جاری کیا جائے۔ میٹنگ میں حالات حاضرہ پر غور وخوض ہوگا ناظم صاحب نے کہا کہ مبارک پور کے عوام دارالعلوم اشرفیہ کے تمام اختیارات حافظ ملت کو سونپ چکے ہیں اب نہ تو کوئی کمیٹی ہے نہ کوئی عہدہ دار یہ سننا تھا کہ

مولانا مظفر میاں صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا مثنیٰ میاں کے چبھتے ہوئے جملوں نے اور بھی آگ میں تیل کا کام کیا اس دن واضح طور پر دیکھا گیا کہ ان اکابر کی کمان مثنیٰ میاں کے ہاتھ میں تھی، سرکارکلاں سے کہا گیا کہ حضرت اٹھئے -اب ہمارا یہاں کیا کام؟ چنانچہ یہ حضرات ایک گلاس پانی پئے بغیر دفتر سے اٹھ گئے پانی پیش کیا گیا اس پر بھی فقرے کسے گئے -اب یہاں سے محمد طفیل اشرفی کے گھر گئے وہاں سے شہر اعظم گڈھ گئے غالباً وہیں رات میں قیام کیا پھر کچھوچھہ شریف سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جوقومی آواز میں ۳۱رمئی کو شائع ہوا جس کی نقل درج ذیل ہے-

''دارالعلوم میں اقتدار اعلیٰ! ممبران مجلس شوریٰ کا بیان-

کچھوچھہ شریف! ۲۳رمئی دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کی مجلس شوریٰ کے اعزازی ممبران مولانا سید غلام جیلانی صاحب میرٹھی مولانا محمد سلیمان صاحب شیخ الحدیث مدرسہ اظہار العلوم ماچھی پور، مولانا شمس الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ حمیدیہ رضویہ بنارس، اور مولانا محمد یونس صاحب، مہتمم جامعہ نعیمیہ مرادآباد نے ایک مشترکہ بیان میں بتایا کہ گزشتہ ۲۲رمئی کو جب وہ دارالعلوم کے سرپرست مولانا سید مختار اشرف کی طلبی پر ان کے زیر قیادت مبارک پور پہنچے تو وہاں دارالعلوم کے ناظم اعلیٰ قاری محمد یحیٰ نے انہیں بتایا کہ مبارک پور کے عوام نے ادارہ کا اقتدار اعلیٰ شیخ الحدیث مولانا حافظ عبدالعزیز کو سونپ دیا ہے-اور اب یہاں نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ مجلس شوریٰ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ مولانا عبدالعزیز کسی کی ماتحتی میں رہ کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں-مجلس شوریٰ کے ارکان نے کہا ہے کہ ان کا تقرر تقریباً دوسال قبل ادارہ کے سرپرست نے اس وقت کیا تھا جب مولانا عبدالعزیز نے ادارہ کے استحکام کے لیے علما پر مشتمل مجلس شوریٰ مقرر کئے جانے پر اصرار اور بصورت دیگر مستعفی ہوجانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مولانا عبدالعزیز کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے موقف اور منشا اور رویہ کی تبدیلی کے پورے اسباب معلوم نہیں ہوسکے لیکن جوصورت حال اب پیدا ہوگئی ہے اس کے متعلق مبارک پور میں طرح طرح کے شبہات پائے جاتے ہیں-مجلس شوریٰ کے ارکان کا کہنا ہے کہ دارالعلوم کی فضا کو مکدر ہوتے دیکھ کر ہم لوگ ۲۲رمئی کو ہی وہاں سے ایک صاحب کے گھر چلے گئے اور رات میں جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو عوام کے جم غفیر نے

سرپرست زندہ باد اور ممبران مجلسِ شوریٰ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے جو دور تک سنائی دے رہے تھے۔ مجلسِ شوریٰ کے ارکان کے ساتھ مولانا سید مظفر حسین سابق ایم پی مولانا حسن مثنیٰ انور مدیر المیز ان اور ولی عہد سجادہ سرکار کلاں مولانا سید اظہار اشرف بھی مبارک پور گئے تھے۔

قومی آواز میں یہ خبر پڑھنے کے بعد میں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دفتر میں اخبار رکھا ہوا تھا قاری صاحب نے کہا: اس کے بارے میں حافظ جی وغیرہ سے مشورہ ہو چکا ہے اس کا جواب نہ دینا ہی اس کا بہترین جواب ہے۔ اس طرح جو لوگ فضا کو مسموم کرنا چاہتے ہیں ان کا داؤ کارگر نہیں ہوگا لیکن آسمان اس وقت ٹوٹ پڑا جب خود سرکار کلاں کی طرف سے ایک اہم اعلان کا اشتہار حاجی محمد سراج گرہست کے ذریعے قاری صاحب کو موصول ہوا جسے پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ فی الواقع یہ اعلان سرکار کلاں کی طرف سے ہے۔ جو لوگ سرکارِ کلاں کے مزاج وطبیعت سے واقف ہیں وہ کبھی اس اعلان کو سرکار کلاں سے منسوب کر ہی نہیں سکتے۔ ہر پھر کے شک کی سوئی اسی ذات شریف کی طرف گئی جس کا ذکر خیر کیا جا چکا ہے اشہار کا متن ملاحظہ ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سجادہ نشین آستانۂ اشرفیہ سرکارِ کلاں کا اہم اعلان

مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب صدر المدرسین دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور ضلع اعظم گڑھ نے اپنے چند بہی خواہوں اور حاشیہ نشینوں کے ساتھ دارالعلوم ہذا (جس کے بانی میرے جدِ امجد قطب ربانی محبوب سبحانی شیخ المشائخ پیر طریقت اعلیٰ حضرت مولانا الحاج سید شاہ علی حسین صاحب اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین آستانہ اشرفیہ سرکارِ کلاں کچھوچھہ شریف تھے) اس کی مجلس منتظمہ سے بغاوت کر دی ہے جس کا میں سربراہِ اعلیٰ اور سرپرست اعظم ہوں اور ایک عرصہ سے میری ہی سرپرستی اور نگرانی میں دارالعلوم کا نظام دستور کے مطابق چلتا رہا۔ مجھ سے پہلے خانوادۂ اشرفیہ ہی کی عظیم المرتبت شخصیتوں کی سرپرستی میں اس کا نظام چلتا رہا مگر یہ وقت کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ مولانا موصوف کے ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کو کسی کی سربراہی راس نہ آئی اور ان کو یہ پسند نہ آیا کہ وہ اپنے کو کسی کے روبرو جوابدہ تصور کریں۔ اس لیے انہوں نے صرف یہی

نہیں کہ دستور مجلسِ منتظمہ کو اپنے خیال میں توڑ دیا بلکہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ جو اکابرین ملت اسلامیہ پر مشتمل تھی اس کی سربراہی اور میری بااختیار سرپرستی سے بھی انکار کر دیا- یہ سب کچھ کر کے انہوں نے اپنے طور پر ایک فرضی کمیٹی تشکیل کی ہے اور ایک نیا دستور بھی وضع کر لیا ہے اور فرضی کارروائیاں کرا کے اسے رجسٹرڈ بھی کرا لیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے نہ جانے کس مصلحت کی بنیاد پر اپنے وضع کیے ہوئے دستور میں میری اطلاع کے بغیر اور میری اجازت ومنشا کے خلاف مجھے ایک ایسا سرپرست قرار دیا ہے جس کو کوئی اختیار نہیں اور خود مولانا موصوف کو اس مبینہ دستور میں بالکل سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا گیا ہے گویا مدرسہ ہذا قوم مسلم کا نہیں بلکہ خود مولانا موصوف ہی کی ذاتی ملکیت ہے- اس تحریر کا منشاء صرف یہ ہے کہ میرے تمام احباب اس حقیقت حال سے آگاہ ہو جائیں کہ مولانا عبدالعزیز صاحب کے موجودہ بنائے ہوئے نظام کو میری طرف سے کسی طرح کا تعاون ومنظوری حاصل نہیں لہذا ان کی عطا کردہ بے اختیار سرپرستی کو قبول کرنے کا سوال ہی کیا ہے جب کہ میں مدرسہ ہذا کی مجلسِ منتظمہ کا بااختیار سرپرست ہوں اور اس کی مجلس علما کا باتفاق رائے دستوری طور پر چیرمین ہوں جو مولانا موصوف کے مشروط استعفا کی بنیاد پر دستوری ترمیمات کے ذریعہ عالم وجود میں لائی گئی- مولانا موصوف اپنے حاشیہ نشینوں کے ساتھ آمرانہ حیثیت سے مدرسہ پر اگر قابض ہونے کے لیے کوشاں ہیں تو اس سے ادارہ پر ان کا حق کیسے ثابت ہوتا ہے- اپنے وضع کردہ دستور میں اپنے کو بزعم خود حین حیاتی سربراہ اعلیٰ کر کے سیاہ وسفید کا مالک بنانا اور مجھے بے اختیار سرپرستی کے خانہ میں رکھنا ایک فریب کارانہ حرکت اور خانوادۂ اشرفیہ کے وقار کو زبردست ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہے-

اب اگر دارالعلوم کے اس فرضی نظام کے تحت جو مولانا موصوف کی سربراہی میں مرتب کیا جانا بتایا جاتا ہے دارالعلوم کا کوئی سفیر یا کوئی شخص اس فرضی نظام کے ساتھ میری ہمدردی بتائے یا کسی طرح میرا اشتراک وتعاون ظاہر کرے تو وہ یقیناً زبردست فریب دینا چاہتا ہے-

سید مختار اشرف

سجادہ نشیں و سرپرست مدرسہ اشرفیہ مبارک پور

یہ اشتہار چونکہ سرکارکلاں کی طرف سے شائع ہوا تھا اس لیے بدگمانیوں کے سدِ باب کے لیے حضرت قاری صاحب نے ہمیں طلب کیا اور ہدایت فرمائی کہ اس کا جواب دیا جائے چنانچہ

قاری صاحب کے تعاون سے اظہارِ حقیقت کے عنوان سے ایک تحریر مرتب کی گئی جس کا متن درج ذیل ہے:

اظہارِ حقیقت:

دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے متعلق ایک نہایت ضروری اعلان حافظ ملت شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حافظ عبدالعزیز قبلہ دامت برکاتہم کے دم قدم کی برکتوں سے دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کا عروج وفروغ اور آسمان کے بادل کی طرح اس کا علمی فیضان اور اس کی عالمگیر شہرت اب محتاج تعارف نہیں ہے۔

سنی دنیا کے حافظ ملت کے حق میں دعا گو رہنے کے لیے ان کی یہی خدمات کیا کم ہیں مزید برآں انہوں نے اپنی کبرسنی اور ضعف ونقاہت کے باوجود چند سال سے دارالعلوم اشرفیہ کو ایک سنی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جس کے لیے قصبہ سے باہر ایک وسیع زمین بھی خریدی گئی ہے۔لیکن انتظامی تاریخ کا یہ بھی ایک عظیم المیہ ہے کہ تقریباً چالیس سال سے دارالعلوم ہذا جس نظامِ عمل کے تحت چل رہا تھا اس نے دارالعلوم میں آج تک کوئی دستور نافذ نہیں کیا۔ ادھر سنی یونیورسٹی کے قیام سے متعلق نئی اسکیم پر عمل درآمد کے لیے حضرت حافظِ ملت کا کئی سال سے پیہم تقاضا تھا کہ جب تک ایک دستور کے نفاذ کے ذریعہ آئینی سطح پر اہلِ سنت کے حق میں ادارہ کا مستقبل محفوظ نہیں ہوجاتا ہمارے لیے نئی اسکیم کا آغاز ممکن نہیں ہوگا۔

حضرت موصوف کے مطالبے کی تکمیل کے لیے ہم نے سابق نظام عمل کے ارباب حل و عقد کی طرف بار بار رجوع کیا لیکن افسوس کہ اس سلسلہ میں ہماری کوئی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ جب بار بار کے اصرار کے باوجود حافظ ملت دستور کی طرف سے مایوس ہوگئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ چند سال اور انتظام میں گزر گئے تو عمر طبعی کی وجہ سے ان کے قوی اس عظیم کام کے قابل ہی نہیں رہ جائیں گے تو انہوں نے کسی دوسرے مقام پر اپنے عظیم منصوبے کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کرلیا۔

جب اہلِ مبارک پور کو ان کے اس ارادہ کی خبر ہوئی تو سارے قصبے میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ سابق نظام عمل کی جمود پسندی سے ہم تنگ تو تھے ہی اس واقعہ نے یہاں کے عوام کو اور بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا چنانچہ اپنے قصبہ کے علمی مستقبل کو تاریکی سے بچانے کے لئے ۲۲ اور

۲۳/اپریل ۱۹۷۱ء کو مبارک پور اور ملحقہ مواضعات کے کئی ہزار مسلمانوں کے ہنگامہ خیز اجلاس منعقد ہوئے جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس نظام عمل کی بے عملی اور غیر ترقی پسندانہ پالیسی ہمارے روشن مستقبل کی راہ میں حائل ہوا سے منسوخ کر کے ادارہ کا ایک فعال اور ترقی پسند نظام عمل وجود میں لایا جائے جس کا سربراہ حافظ ملت کو بنایا گیا تا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اہلِ سنت کے حق میں ادارہ کا مستقبل محفوظ کر کے نئی اسکیم پر عمل درآمد کا کام شروع کریں۔

خدا کا شکر ہے کہ دستور کے نفاذ کا جو مرحلہ سابق نظام عمل کے طویل عہد میں طے نہیں پا سکا تھا وہ نئے نظام کے زیر اثر چند ہفتے میں مکمل ہو کر رجسٹرڈ ہو گیا- فالحمد للہ علیٰ ذلک

اب خدائے کارساز نے چاہا تو اس دستور کی روشنی میں ہم آئندہ سال ایک وسیع رقبہ زمین پر دارالعلوم اشرفیہ کی توسیع کا سنگ بنیاد رکھیں گے جسے ہم سنی یونیورسٹی کے دیرینہ خواب کی تعبیر قرار دے سکیں گے-

یہ تھے وہ ناگزیر اسباب وحالات جن کے تقاضوں پر مبارک پور کے سنی مسلمانوں نے اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے سابق نظام عمل کو توڑ کر ایک نئے نظام عمل کو وجود بخشا-

لیکن ایک تازہ اشتہار جس کا عنوان ہے ''سجادہ نشیں آستانۂ اشرفیہ کلاں (کچھوچھہ شریف) کا ایک ''اہم اعلان'' پڑھ کر ہم سکتے میں پڑ گئے- ہمارا جذبۂ عقیدت کسی طرح بھی اشتہار کے مضمون کو اس مقدس آستانہ کے سجادہ نشیں کی طرف منسوب کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جس میں حافظ ملت جیسے خیر پسند، ایثار پیشہ، سراپا اخلاص، تقویٰ شعار اور خدا ترس بزرگ کو ڈکٹیٹر، فریب کار اور باغی کہا گیا ہے- معاذ اللہ، اور حافظ ملت کی اجازت ورائے کے بغیر جو اقدام مبارک پور کے سنی عوام نے سرتا سر اپنے ضمیر کی آواز پر کیا تھا اسے حافظ ملت کی طرف منسوب کر کے ایک نہایت غلط اور خلاف واقعہ بات کہی گئی ہے جس پر ہم اپنے گہرے رنج وقلق کا اظہار کرتے ہیں-

فضل الرحمن مصباحی، محمد ابراہیم، محمد سراج، اقبال احمد، محمد مختار

قاری صاحب بڑے خوش اخلاق، زندہ دل عالم باعمل تھے حافظ ملت سے منسوب ایک روایت ہے کہ آپ اکثر وبیشتر فرمایا کرتے تھے ''میں نے قاری محمد یحییٰ جیسا قاری ہندوستان میں نہ پایا'' حافظ ملت نے آپ کو قصبہ کی تاریخی جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کا خطیب وامام مقرر فرمایا

تھا اب آپ کے فرزند اکبر مولانا قاری الحاج محمد نعیم مدظلہ العالی منصب امامت پر فائز ہیں-

۱۵؍مئی ۱۹۹۶ء کو فجر کے وقت آپ نے اس دارِ فانی سے دار بقا کے لیے رخت سفر باندھا-اناللہ وانا الیہ راجعون-

نوگزے پیر بابا کے مشہور قبرستان میں حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قرب میں مدفون ہوئے-آپ کا عرس چہلم ۲۳؍جون کو ہوا جس میں اہلِ قصبہ اور اشرفیہ کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے آپ کے تلامذہ شریک ہوئے-راقم الحروف بھی موسم گرما کی تعطیل میں اپنے مسقط الراس میں تھا-

رات میں تقریری پروگرام تھا، فقیہ اعظم ہند حضرت علامہ شریف الحق امجدی اور بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی جیسی باوقار شخصیتیں اسٹیج کی زینت تھیں-مولانا علی احمد سیوانی ناظم اجلاس تھے-میں نے درج ذیل ارتجالیہ منقبت کے ذریعہ اپنی حاضر درج کرائی-

حرفِ صدا

میں کہ اک کمتر بے مایہ ہوں
مجھ کو کیا حق ہے کہ اظہارِ خیالات کروں
ہاں مگر تسلیہ خاطر محزوں کے لیے
مجھ کو لازم ہے کہ خود اپنی مدارات کروں
ایک آواز جو حرفوں میں بدل کر خود کو
دوش پر ہو کے ہواؤں کے سوار
فرش گیتی سے اٹھی جانب افلاک گئی
عالم نور کا ہر فرد اسے سنتے ہی پہچان گیا
سر بجم ہو کے فرشتوں نے اس آواز مقدس کا کیا استقبال
پھر وہ آواز جو حرفوں کے سبب باعث تکریم ہوئی
حضرت عزت میں گئی
وہ حروف اور کسی کے نہیں قرآن کے تھے
اور آواز لبِ قاری مرحوم کی تھی

(ماہنامہ جام نور، از دسمبر ۲۰۱۰ء تا فروری ۲۰۱۱ء)

فیض العارفین مولانا غلام آسی پیا

مے نمی نوشی مگر ہم رنگ مستاں زیستی

اشرفیہ کے خمستان علم وعرفاں کے بادہ نوشوں میں جن رندحق آگاہ کا نام آج بھی مبارک پور کے گلی کوچوں میں لیا جاتا ہے، وہ نام فیض العارفین مولانا غلام آسی پیا کا ہے- یہ بزرگ میرے دور طالب علمی سے پہلے اپنی بساط رشد وہدایت بچھا چکے تھے-خلق خدا آپ کے کردار وعمل کے آئینے میں اسلام کا چہرہ دیکھتی تھی- تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی افکار ونظریات کی اشاعت میں ان بزرگان دین کا وافر حصہ ہے جنھوں نے مدارس سے کسب علوم کر کے خانقاہوں کو مرکز تبلیغ وارشاد بنایا- یہ بزرگ پہلے علم دین حاصل کرتے ،شیخ طریقت سے بیعت ہوتے ،سلوک کی منزلیں طے کرتے ،مجاہدے کرتے اور کن فقیہاً صوفیاً ولاتکن صوفیاً فقیہاً کا پیکر بن کر گم کردگان راہ کی ہدایت فرماتے- دماغ شریعت کے اوامر ونواہی سے آگاہ ہوتا، دل ان کو برتنے کی ترغیب دیتا، یوں یہ نفوس قدسیہ ان سارے اوصاف کے حامل ہوتے جن کا شریعت مطہرہ مطالبہ کرتی -مولانا غلام آسی پیا علیہ الرحمہ نے اسی جادۂ حق کو اختیار کیا اور ''فیض العارفین '' کے عظیم لقب سے ملقب ہوئے-

میرے دور طالب علمی میں مبارک پور میں آپ کے علم وفضل اور زہدو ورع کا چرچا تھا،لیکن میں شرف ملاقات سے محروم تھا- پہلی بار اسلامیہ قبرستان لکھنؤ میں حضرت نبی رضا شاہ علیہ الرحمہ کے عرس کے موقع پر آپ سے نیاز وملاقات کا موقع ملا- ان دنوں میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا، درگاہ نبی رضا شاہ علیہ الرحمہ کے حجرے میں آپ شیوخ کرام کے مشار الیہ تھے، آستانہ شاہ مینا کے سجادہ نشین، تکیہ کاظمیہ کاکوری کے متولی، خانقاہ صفی پور اور بھینسوڑی شریف کے شیوخ کے جھرمٹ میں آپ کی الگ پہچان تھی- چائے کے وقفہ کے دوران میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف پیش کیا تو مبارک پور کی سکونت، حافظ ملت سے تلمذ

اوراشرفیہ کی مجلس انتظامیہ وشوریٰ کی رکنیت میرے اعزاز وافتخار کا باعث بن گئی۔حضرت اقدس کا چہرہ کھل اٹھا اور دیر تک اپنے قیام مبارک پور کے دور کا ذکر فرماتے رہے۔تھوڑی دیر میں مشائخ کرام میں سلوک وتصوف کے موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، فیض العارفین اور تکیہ کاظمیہ کے علوی بزرگ لطائف بیان کرتے رہے، رقص وسماع کے موضوع پر بار بار امام غزالی کے قول سے استشہاد کیا جاتا، مجھے تفصیل یاد نہیں ہے، اثنائے گفتگو علوی صاحب نے ایک شعر پڑھا:

اے مطرب خوش قا قا توقی قی ومن قو قو

تو دق دق ومن حق حق تو ہی ہی ومن ہو ہو

یہ شعر سن کر بعض پیران طریقت جھوم اٹھے۔شعر کے مفہوم تک میری رسائی نہیں ہوئی لیکن الفاظ کے دروبست اور زیر وبم سے جو نغمگی پیدا تھی اس سے میں محظوظ ہوا۔اسی وقت ایک کاغذ کے ٹکڑے پر شعر لکھ لیا۔نشست ختم ہونے پر میں نے علوی صاحب سے پوچھا کہ یہ شعر کس بزرگ کا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ شعر عارف باللہ مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے، یہ تصوف کے اسرار ورموز کا خزانہ ہے۔

قارئین جام نور کو یاد ہوگا، سالوں پہلے میں نے ایک سال خوردہ سنبھلی کی قابل رحم حالت پر ترس کھاتے ہوئے، ان کی ترطیب دماغ اور تفریح قلب کے لیے مولانا روم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ شعر اس نیت خیر کے ساتھ ہدیہ کیا تھا کہ اگر وہ خلوص دل سے اسے بطور وظیفہ پڑھیں گے تو ہذیانی کیفیت اور افلاس قلب دونوں سے نجات مل جائے گی، مگر افسوس وہ میرے خلوص کی قدر نہ کر سکے، الٹے یہ کہہ کر قہر الٰہی کے سزاوار ہو گئے کہ **"شر رصاحب نے آخر میں فارسی کا جو شعر نقل کیا ہے، ایسے شعر مسخروں کو یاد ہوتے ہیں، وہی ان کو یاد رکھتے ہیں اور وہی ہنسانے کے لیے سنایا کرتے ہیں"**۔اللہ تعالیٰ صابر سنبھلی کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔بزرگوں کے ساتھ اس طرح کی مسخرگی سے سلب ایمان کا خطرہ ہوتا ہے۔

لکھنؤ سے طبابت کا کورس مکمل کر کے میں نے ۱۹۶۹ء میں مبارک پور میں مطب کا آغاز کیا۔اب فیض العارفین سے ہمارا دور کا رشتہ بھی قائم ہو چکا تھا۔وہ یوں کہ حافظ عبد الکریم صاحب مرحوم کی صاحبزادی میری اہلیہ کے بھائی کے عقد میں آ چکی تھیں۔اس کے بعد فیض العارفین مبارک پور تشریف لاتے تو میرے سسر الحاج محمد سعید صاحب مرحوم (سابق ناظم اعلیٰ

ونائب صدر الجامعۃ الاشرفیہ) کے در دولت پر اپنی بھتیجی کی خیر خبر لینے کے لیے قدم رنجہ فرماتے- آپ کی تشریف آوری کی خبر ہوتے ہی محلے کے اہل عقیدت کی بھیڑ لگ جاتی- مجھے محلے کے وابستگان سلسلہ کی تعداد کا اندازہ نہیں ہے، لیکن یہ بات انتہائی حیرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ حافظ ملت کے زمانہ حیات میں فیض العارفین کے مریدوں کی تعداد سب سے زیادہ آپ ہی کے محلہ پرانی بستی میں تھی- یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فیض العارفین سے پہلے سلسلۂ ابوالعلائیہ سے اہل قصبہ نابلد تھے- پرانی بستی میں آج بھی فیض العارفین کے نام سے ایک پرنٹنگ پریس ہے- خانقاہ ابوالعلائیہ کے نام سے محلہ علی نگر میں پولیس اسٹیشن کے قریب ایک قطعہ آراضی بھی مختص ہے- **فجزاہ اللہ خیر الجزاء.**

ایک دن حضرات اقدس میرے مطب میں تشریف لائے ، دست شفا کے لیے دعا فرمائی اور ایک درود شریف لکھ کر مجھے عطا فرمایا، صیغۂ درود یہ تھا:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ طَبِیْبِ الْقُلُوْبِ
وَدَوَائِهَا وَعَافِیَۃِ الْاَبْدَانِ وَشِفَائِهَا وَنُوْرِ الْاَبْصَارِ وَضِیَائِهَا
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

میں نے یہ مبارک تحریر محفوظ کر لی- تھوڑی دیر کے بعد آپ کا ایک فرستادہ آیا اس نے کہا کہ حضرت نے فرمایا ہے کہ درود شریف میں سبقت قلمی سی طب القلوب کی جگہ طبیب القلوب ہو گیا ہے، اس کو درست کر لیا جائے-

فیض العارفین کو حضرت شاہ مینا اور حاجی الحرمین سے بڑی عقیدت تھی- لکھنؤ تشریف لاتے تو ان دونوں بارگاہوں میں بالالتزام حاضری دیتے- یہ دونوں بزرگ کنگ جارج میڈیکل کالج کے احاطے کے اندر مدفون ہیں- نو چندی جمعرات کو شاہ مینا کے مزار پر سالانہ عرس کا سا ازدحام ہوتا ہے- یہیں فیض العارفین کی منشی عبدالعلیم بقائی علیہ الرحمۃ سے ملاقات ہوئی- جب بقائی صاحب کو معلوم ہوا کہ فیض العارفین عالم دین اور حافظ ملت کے تلامذہ میں ہیں تو ان کے قدموں سے لپٹ گئے- فیض العارفین ہی کے توسط سے بقائی صاحب کی مجھ پر بھی بے پایاں شفقت رہی- صفی پور کے عرس میں جو کہ بقائی صاحب کے زیر اہتمام ہوتا تھا، میں نے کھلی آنکھوں سے ان کی کرامت دیکھی ہے-

کرنیل گنج کے دار العلوم یتیم خانہ صفویہ میں بین المدارس طلبہ کا قرأت وتقریر کا مقابلہ ہوا تو بقائی صاحب نے قاری محب الدین احمد (والد گرامی قاری احمد ضیا ازہری) کو قراءت کے لیے اوراس بندۂ آثم کو تقریری مقابلہ کے لیے حکم بنایا تھا۔

۱۹۷۹ء میں جب میرا تقرر دہلی کے طبیہ کالج میں ہوا تو مجھے فیض العارفین اور رئیس القلم سے استفادہ واستفاضہ کے زیادہ مواقع میسر آئے۔علیہماالرحمہ۔

اوائل 1982 کی بات ہے حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ نے جب دہلی کو دینی تعلیمی مرکز بنانے کا پلان کیا تو اس کے لیے سب سے موزوں اور متبرک جگہ دیار محبوب الٰہی نظر آئی۔ پیر سید ضامن علی نظامی سجادہ نشین سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ آپ نے ان سے ملاقات کر کے اپنے منصوبہ سے انہیں مطلع کیا اور سر دست اس کار اہم کے آغاز کے لیے ایک مسجد کی نشاندہی فرمائی جو نظامی صاحب کی تولیت میں تھی۔ نظامی صاحب نے مجوزہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کا نام سنتے ہی مبارکباد پیش کی اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ جس مسجد کی نشاندہی کی گئی ہے، آپ یہاں سے کام کا آغاز کیجئے، اب ضرورت ہوئی کہ ایک مدرس اور چند طلبہ کا فوری طور پر انتظام کیا جائے۔ یہ دشوار مرحلہ یوں سر ہوا کہ رئیس القلم نے اپنے برادر بزرگ حضرت فیض العارفین کو تفصیلات سے باخبر کرتے ہوئے ان سے گزارش کی کہ ایک حافظ اور چند طلبہ کا انتخاب کر کے ان کو جلد از جلد اپنے ہمراہ لائیں۔ چنانچہ فیض العارفین نے بھینسوڑی شریف کے اپنے مریدوں میں سے ایک حافظ اور 9 طلبہ کا انتخاب کیا اور دہلی روانہ کر دیا۔ یوں جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے نام سے مسجد میں تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ بچے مسجد میں پڑھتے تھے، قیام بھی کرتے تھے اور حافظ صاحب کا قیام مسجد کے حجرہ میں رہتا تھا۔ دو تین ماہ کے بعد دونوں بزرگوں نے باہمی مشورت سے طے کیا کہ بوجوہ چند محلے کے بچوں کا داخلہ بھی ضروری ہے اور مجلس انتظامیہ میں کم از کم دو عہدہ دار درگاہ کے خدام و وابستگان میں سے ہونے چاہئیں۔ بھینسوڑی شریف کے حافظ صاحب اپنے والد ماجد کی علالت کی وجہ سے دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو رئیس القلم نے فیض العارفین سے کہا کہ بھائی صاحب! اس تالے کی کنجی آپ ہی کے پاس ہے۔ فیض العارفین نے اس عقدہ کو یوں حل کیا کہ ضلع بلیا کے حافظ عبدالکریم صاحب کو خط لکھ کر بلا لیا جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا

ہے، ان کے آنے کے بعد تعلیم وتدریس کا تسلسل برقرار رہا-

رئیس القلم طلبہ پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے اس کے علی الرغم فیض العارفین میں ترحم کا عنصر غالب تھا، ان دنوں دونوں بزرگ بستی نظام الدین میں فروکش تھے- میں تقریباً روزانہ قرول باغ سے بستی نظام الدین جایا کرتا تھا، بلکہ طلبہ کے علاج ومعالجہ کی ذمہ داری میرے سر تھی-طلبہ سمجھتے تھے کہ ادارہ کے انتظامی امور میں میرا بہت عمل دخل ہے-ایک دن چند طلبہ نے مجھ سے کہا کہ ہوٹل سے ہمیں صرف دو روٹیاں ملتی ہیں، ہم میں سے بعض طالب علم کا پیٹ نہیں بھرتا- میں نے کہا کہ یہ بات تم میں سے کسی نے علامہ سے نہیں کہی؟ طلبہ نے جواب دیا کہ ان سے ہمیں بہت ڈر لگتا ہے، ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیں گے، میں نے اس کی اطلاع فیض العارفین کو دی-

پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا لیکن جب آصف اور الیاس کو بلا کر ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شکایت بجا ہے، حضرت فیض العارفین نے مجھے اپنے ہمراہ لیا اور علامہ کے پاس جاتے ہی کہا کہ مہمان رسول کو بھوکا مارو گے؟ علامہ نے کہا کہ بھائی صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں! میں نے مداخلت کرتے ہوئے واقعے کی تفصیلات بتائیں تو علامہ نے کہا کہ دو روٹیوں سے تو میں شکم سیر ہو جاتا ہوں وہ تو سب کے سب بچے ہیں، میں نے اسی لیے ہوٹل والے کو ہدایت کی تھی کہ سالن کے ساتھ دو دو روٹیاں ہر طالب علم کو دی جائیں اور سب کی حاضری نوٹ کی جائے-تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ہوٹل والا طلبہ کو چھوٹی چھوٹی روٹیاں دیتا تھا اور جو روٹی علامہ کے یہاں آتی تھی وہ بڑی ہوتی تھی، اس کے بعد ہوٹل بھی بدل دیا گیا اور روٹیوں کی تعداد کی قید بھی اٹھالی گئی-

ایک دن فیض العارفین نے مجھ سے کہا کہ تفہیم القرآن کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں- میں نے کہا میرے پاس ہے، میں حاضر کردوں گا- دوسرے دن میں نے تفسیر پارۂ عمّ بھجوادی- ہفتہ عشرہ کے بعد کتاب واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے بعض ضروری مقامات پر حواشی لگادیے ہیں ان کو پڑھ لینا، میں نے دیکھا کہ مولانا مودودی نے جہاں کہیں مسلک حق کے خلاف گل افشانی فرمائی تھی، اس کا رد بلیغ کردیا ہے، جب میں واپس ہونے لگا تو مجھے روک کر کہا کہ سنو! کتاب تمہاری ملکیت تھی، میں نے صرف مطالعہ کے لیے مانگی تھی-اس پر مجھے لکھنا نہیں چاہیے تھا، لیکن میں نے اس اعتماد پر لکھا ہے کہ جب تم اسے پڑھو گے تو خوش ہوگے اور اگر لکھنے کی اجازت مانگتا تو تم خوشی

خوشی اجازت دیتے- جیسا کہ میں سطور بالا میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت فیض العارفین پہلے عالم تھے پھر علم تصوف حاصل کر کے منازل سلوک طے کیے تھے- یہاں انہوں نے شرعی نقطۂ نظر سے ایک دخل مقدر کا جواب دیا ہے-

ایک دن حضرت فیض العارفین جامعہ کے کمرے میں (مسجد کے حجرے میں) بیٹھے ہوئے تھے، میں بعض طلبہ سے صحن مسجد میں گفتگو کر رہا تھا- یکا یک بلند آواز سے مجھے بلایا- میں بھاگتا ہوا گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ حدائق بخشش کا ایک صفحہ نشان زد کر کے درج ذیل شعر جھوم جھوم کر پڑھ رہے ہیں:

یللے خوش آمدم در کوئے بغداد آمدم
رقصم و جو شد زہر مویم ندا امداد کن

جیسے ہی میں پہنچا فرمانے لگے، یہ اعلیٰ حضرت کا شعر ہے، اعلیٰ حضرت بھی رقص کے قائل نظر آتے ہیں- دیکھئے اس شعر سے تو یہی مستفاد ہے- حضرت فیض العارفین سماع کے قائل تھے بلکہ محفل سماع میں بے روک ٹوک شریک ہوا کرتے تھے یہ ان کی روحانی غذا تھی- مذکورہ شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے- کہنے لگے: جناب کوئی کیسا ہی ہوشیار ہو جب جذب صادق ہوتا ہے اور کیفیت طاری ہوتی ہے تو ساری ہوشیاری مستی کی نذر ہو جاتی ہے- قربان جائیے اس عالمانہ شان اور حزم و احتیاط پر کہنے لگے:

''میں نے ''یللے'' والا شعر بالکل اپنے مزاج کے مطابق پایا- جو کچھ میں نے کہا ہے (اعلیٰ حضرت بھی رقص کے قائل ہیں) اس کو تفنن سے زیادہ کچھ اور نہ سمجھنا-''

ایک دن میں نے حضرت فیض العارفین سے گزارش کی کہ حضور کبھی میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمائیں! حضرت نے کہا کہ کبھی کیوں آج ہی کیوں نہیں؟ میں نے فوراً گھر پر فون کیا کہ حضرت مولانا غلام آسی پیا آج شام کو تشریف لائیں گے (میری اہلیہ اسی نام سے انہیں جانتی تھیں) چنانچہ شام کو میں حضرت اقدس کے ساتھ پرنسپل کوٹھی طبیہ کالج گیا، اس کوٹھی کی انیکسی II میرے نام الاٹ ہے اور انیکسی I ڈاکٹر کمل کشور سجوریا کے نام، صدر دروازہ ایک ہے اور وسیع و عریض آنگن مشترک ہے- جب حضرت تشریف لائے تو ڈاکٹر سجوریا کی فیملی نے بھی استقبال

کیا-حضرت نے کہا کہ اسی آنگن میں بستر لگاؤ یہ بہت اچھی جگہ ہے- میرے بچے اور سجوریا کی فیملی کے بعض ارکان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں-فیض العارفین چارپائی پر بیٹھے بزرگوں کی حکایات سنارہے ہیں-عشاء کے بعد چند لقمے تناول فرما کر ہم سے کہا کہ جاؤ اپنی نیند خراب مت کرو-صبح کو ڈاکٹر سجوریا نے مجھ سے کہا کہ میں رات ۱۲ بجے کے بعد دوبارآنگن میں آیا اور بابا کو اسی طرح چارپائی پر بیٹھے پایا-کبھی اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتے ،کبھی دائیں بائیں گھماتے ، بابا بہت پہنچے ہوئے بزرگ معلوم ہوتے ہیں-صبح کا ناشتہ ہم سب نے ایک ساتھ مل کر کیا-اسی دوران حضرت نے فرمایا کہ چند روز کے بعد میں اجمیر شریف جاؤں گا، ڈاکٹر سجوریا نے کچھ روپے دیے کہ یہ ہماری طرف سے خواجہ صاحب کے مہمانوں کی بھینٹ ہے،اس کے بعد سے میرے گھر سے جب بھی کوئی فرد اجمیر شریف جاتا ہے ڈاکٹر سجوریا خواجہ صاحب کے مہمانوں کے لیے کچھ روپے ضرور بھجواتے ہیں-

مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی جب لوک سبھا کا الیکشن لڑکر دوبارہ ایم پی ہوئے تو انہیں عارضی طور پر D1Z ایریا میں ۱۲ نمبر کا فلیٹ الاٹ کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد نارتھ ایونیو میں ۱۵۵ نمبر کا فلیٹ الاٹ ہوا-فیض العارفین کا وہاں آنا جانا بہت کم تھا- رئیس القلم کی آمد ورفت زیادہ تھی- ایک دن میری گزارش پر حضرت اقدس مولانا مظفر میاں صاحب علیہ الرحمہ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے- اثناء گفتگو آپ نے ایم پی صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ مسجد عبدالنبی میں جمعیۃ العلما کا صدر دفتر ہے، جہاں سے وہ اپنے دین دھرم کا کام زور وشور سے کر رہے ہیں،کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ دہلی میں اس طرح کا ہمارا بھی کوئی مرکز ہو جہاں سے سنیت کی تبلیغ کا کام اعلیٰ پیمانے پر کیا جاسکے؟ مظفر میاں نے کہا کہ علامہ ارشد اگر اس کا بیڑا اٹھالیں تو میں ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں- اس کے بعد مولانا اسرارالحق کا دور آیا، یہ ابتداءً وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس کے روم نمبر ۱۰۳ رسی میں رہتے تھے، پھر راجیہ سبھا کے ممبر ہونے کے بعد انہیں کو پرنکس لین میں کوٹھی الاٹ ہوئی، وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس کے زمانۂ قیام میں میں بھی اسی فلیٹ میں رہتا تھا-مولانا اسرارالحق آل انڈیا قومی ایکتا کمیٹی کے صدر تھے-مولانا سید مظفر میاں نائب صدر، علامہ ارشد القادری سکریٹری تھے اور راقم الحروف شرر مصباحی آفس سکریٹری تھا-ایک دن حضرت فیض العارفین تشریف لائے- رمضان المبارک کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا، حضرت

اقدس نے مولانا اسرارالحق صاحب سے کہا کہ میرا ایک مرید ضلع اناؤ میں رہتا ہے، اس کو اپنی حفاظت کے لیے پستول کا لائسنس چاہیے، آپ اناؤ ضلع حکام کو فون کر دیں تو یہ کام آج کا آج ہوجائے گا، کیوں کہ اندرا گاندھی سے آپ کے ربط وتعلق کو سارے حکام جانتے ہیں- مولانا اسرارالحق صاحب نے کہا کہ آپ مطمئن رہیے میں آج کل ہی میں کام کرادوں گا، ضلع حکام سے میں کیوں کہوں گا، میں ڈائریکٹ یوپی کے ہوم منسٹر یا ہوم سکریٹری سے بات کروں گا- فیض العارفین نے مجھے پچاس روپے دیئے اور کہا کہ آج شب قدر ہے، مولانا کے لیے افطار کا سامان خرید لینا، یہ کہہ کر فیض العارفین رخصت ہوئے، میں انہیں پہنچانے گراؤنڈ فلور تک آیا- واپس پہنچا تو مولانا نے کہا کہ کتنے پیسے دیے تھے، میں نے کہا پچاس روپے، بولے لاؤ ادھر کرو، افسوس صد افسوس! فیض العارفین کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مولانا روزہ سے نہیں ہیں، بلکہ روز ایسے ہیں- الحاصل! نہ مولانا نے کسی حاکم یا منسٹر کو فون کیا نہ اس غریب کا کام بنا-

حضرت فیض العارفین کا وصال جین نیورو سینٹر جاگرتی انکلیو وکاس مارگ، نئی دہلی میں ۱۳رجنوری ۲۰۰۳ء بوقت شام پانچ بج کر ۳۰ منٹ پر ہوا- جنازہ اترولہ ضلع بلرام پور لے جایا گیا، جہاں حضرت کی اہلیہ پیرانی اماں مدفون ہیں- غفر اللہ لھما

(ماہنامہ جام نور از اپریل تا مئی ۲۰۱۰ء)

رئیس القلم علامہ ارشد القادری

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تلامذہ میں بڑے بڑے صاحبان فضل وکمال گزرے ہیں، ان کے تصور کے ساتھ کوئی نہ کوئی امتیازی وصف پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے، کوئی تدریس میں یکتا کوئی تحریر میں، کوئی تقریر وخطابت میں ممتاز کوئی تبلیغ وارشاد میں، لیکن ان جملہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ جماعت کی شیرازہ بندی کی دھن میں جو خون جگر جلاتا رہا اس کا نام ارشد القادری ہے، علیہ الرحمۃ والرضوان۔

مدارس کے نظام تعلیم، اساتذہ کے مزاج تدریس اور طلبہ کے طریقۂ تربیت کی قدیم روش میں غیر محسوس تبدیلی تو پہلے سے ہوتی آئی ہے لیکن دینی مدارس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا تصور، فرزندان اسلام میں دیگر اقوام کے افراد سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کا حوصلہ اور معاشرہ میں سر اٹھا کر چلنے کا شعور، غور کیجئے تو ان تشخصات کے پس پردہ رئیس القلم کی شخصیت صاف نظر آئے گی- یہ خواص یوں ہی نہیں پیدا ہوجاتے جب دل، دماغ اور نظر کا مثلث ۶۰ ڈگری کے تینوں زاویوں سے بنتا ہے تب یہ خوبی پیدا ہوتی ہے- علامہ کا دل بیدار تھا، دماغ ہوشیار تھا اور نگاہیں چپ وراست سے باخبر تھیں، اس لیے انہیں وہاں بھی کامیابی ملی جہاں لوگ تھک ہار کر بیٹھ جایا کرتے ہیں- ان کی نظر میں ایک معمولی سوئی بھی معمولی نہیں تھی، ان کی 'قوت دراکہ' اس کے فوائد ونقصانات کا گوشوارہ بنا کر حافظہ میں محفوظ کردیتی تھی- وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے، اگر ہٹتے تھے تو آگے کی سمت کو زور باندھنے کے لیے ہٹتے تھے، یہی ان کی کامیابی کا راز تھا- ''ہر ورقے دفتریست'' کے سرنہاں سے وہ خوب واقف تھے- اس کے علی الرغم وہ دن بھی مجھے یاد ہے جب الجامعۃ الاشرفیہ کی عمارت کا نقشہ ہنوز نہیں بنا تھا، میں لکھنؤ میں تھا- حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مدرس کو لکھنؤ بھیجا، خاص ہدایت یہ تھی کہ وہ ندوۃ العلما کی عمار

تیں دیکھ کر رپورٹ دیں- درس گاہیں کیسی ہیں، دارالاقامہ کیسا ہے، لائبریری ہال کیسا ہے وغیرہ- استاذ گرامی لکھنؤ آئے، میری قیام پر تشریف لائے، آنے کا سبب ارشادفرمایا- پھر ہم دونوں جھوائی ٹولہ سے رکشہ میں سوار ہوئے، اکبری گیٹ آیا، نخاس آیا، رکاب گنج آیا، امین آباد آیا حتیٰ کہ قیصر باغ کی بارہ دری آ گئی- میں نے کہا حضرت سر اٹھایئے ندوۃ العلما کے علاوہ بھی اچھی اچھی بلڈنگیں ہیں، پھر کوئی پندرہ منٹ میں ہم ندوہ پہنچے- وہاں جو دیکھا سو دیکھا- کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، نہ حالات حاضرہ سے واقف ہوتے ہیں نہ اخبارات پڑھتے ہیں- پھر جب علامہ محترم نے جمشید پور کے انجینئر کا ڈیزائن کیا ہوا نقشہ انتظامیہ کے سامنے پیش کیا تو اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا- سربراہ اعلیٰ کی منظوری حاصل ہونے کے بعد نقشہ کے مطابق تعمیری کام شروع ہو گیا-

رئیس القلم کی بصیرت، فکر و تدبر، معاملہ فہمی، حکمت بالغہ، انکسار و تواضع، اسلوب نگارش تمام پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، بعض اہل قلم نے تو ایسا لکھا ہے کہ شنیدہ کو دیدہ بنا دیا ہے اور بعض قلم کاروں نے محض اپنا زور دماغ صرف کر کے داد سخن لی ہے-

رئیس القلم کے امتیازات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ عظیم منصوبہ ساز تھے، اس خصوصیت میں ان کے ہم عصروں میں کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نہیں تھا- رئیس القلم کے معاصرین میں مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی، مولانا مظفر حسن ظفر ادیبی، مولانا مشتاق احمد نظامی، مولانا اسرار الحق اور مولانا ابوالوفا فصیحی وغیرہ تھے- ان حضرات نے تحریر و تقریر کے ذریعے بڑی شہرت حاصل کی، لیکن منصوبہ سازی کا جوہر خاص علامہ کے حصے میں آیا تھا- آپ ہی اپنی خدا داد ذہانت سے نت نئے خاکے بناتے تھے اور حسب استطاعت دوسرے ارکان دولت ان میں رنگ بھرتے تھے- کہتے ہیں شاہجہاں جہاں پڑاؤ ڈالتا تھا، وہاں بطور یادگار ایک مسجد تعمیر کی جاتی تھی- یہ بات کتنی سچ ہے معلوم نہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ رئیس القلم نے اپنے اسفار میں سیکڑوں مدارس قائم کیے، تنظیمیں قائم کر کے جماعت کی شیرازہ بندی کی- موجودہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا واقع ذاکر نگر تو ایک ایسا پل ہے، جس نے مسلم امت کے علمی، اقتصادی اور معاشرتی تینوں شعبوں کو ہم رشتہ کر دیا ہے-

رئیس القلم ہندوستانی تھے، لیکن ان کی فکر آفاقی تھی- وہ ہندوستان میں رہ کر یوروپ،

امریکہ اور افریقہ کی امت مسلمہ کے درد کا مداوا کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے انہوں نے علامہ عبدالعلیم میرٹھی کو اپنا آئیڈیل بنایا تھا- انہوں نے انگریزی زبان کو اسی لیے وقت کی ضرورت قرار دیا تھا کہ اس کے بغیر دیارغیر میں ہمارے داخلے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے- جامعہ حضرت نظام الدین کے قیام کا مقصد اولیں یہی تھا کہ یہاں ایسے اسکالر پیدا کیے جائیں، جن کو دینی علوم کے ساتھ انٹرنیشنل زبان پر بھی عبور ہو- آج رئیس القلم ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی کوششیں بار آور ہوئیں- کل تک ہم مصر، لیبیا، عراق اور سوریہ کے جامعات کو استعجاب کی نظروں سے دیکھتے تھے، احساس نارسائی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا، آج ان ممالک کے علما و فضلا کے لیے جامعہ حضرت نظام الدین اولیا اجنبی نہیں رہا اور جب سے جامعہ ازہر سے اسناد کا معادلہ شروع ہوا ہے، رئیس القلم کا جامعہ دنیا کے علمی نقشہ پر اپنا نشان بنا چکا ہے-

جامعہ کا ذکر آیا تو قاری کے ذہن میں اس کی چار منزلہ عمارت کا تصور آ گیا ہوگا، تعلیمی معیار کا ذکر تو ابھی ابھی ہو چکا ہے، اب میں اس سے پہلے کے بعض تاریخی حقائق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں- میرے بعد ان وقائع کی تفصیلات بتانے والا کوئی نہیں ہوگا- شدہ شدہ واقعات کا علم ماسٹر علی احمد صاحب کو ہے، جو ان دنوں جامعہ حضرت نظام الدین اولیا واقع بستی حضرت نظام الدین اولیا میں تھے اور ان دنوں الجامعۃ الاشرفیہ کے جونیئر ہائی اسکول کے پرنسپل ہیں- جامعہ کے کئی تعارفی رسالوں میں میں نے دیکھا کہ اس مبارک ادارے کی علمی و فکری تحریک کا آغاز محبوب الٰہی کی چوکھٹ سے ہوا- اس سے زیادہ اس کی تفصیل نہیں ملتی- اس کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی، لیکن اپنی وراثت کی حفاظت بھی ضروری ہے- اسی سے تو پتا چلے گا کہ عسرت اور تنگ دستی کے زمانے میں جب کہ ہاتھ میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی، بس کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اور خدا کی ذات پر کامل یقین تھا کہ ہماری دعائے نیم شبی کبھی نہ کبھی باب اجابت تک ضرور پہنچے گی اور الحمدللہ! پہنچ بھی گئی، اس لیے جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کی اولیں تاسیس کے بارے میں کچھ عرض کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا-

جامعہ حضرت نظام الدین اولیا (غالباً) ۱۹۸۱ء میں محبوب الٰہی کی درگاہ سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد میں قائم ہوا- یہ مسجد درگاہ شریف کے صاحب سجادہ سید پیر ضامن نظامی کے زیر تولیت تھی- اس ادارہ کے بانی و مہتم علامہ ارشد القادری تھے- کچھ عرصہ تک اس کی عملاً

نگرانی فیض العارفین کے سپرد تھی کیوں کہ انہیں کے مریدوں میں سے بھینسوڑی شریف سے ایک حافظ صاحب اور نو بچے یہاں آئے تھے، جن سے تعلیم کا آغاز ہوا تھا- کچھ دنوں کے بعد محلہ کے بچوں کا بھی داخلہ ہونے لگا اور ایک انتظامی کمیٹی قائم کر کے درگاہ شریف کے وابستگان میں سے دو افراد کو بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا، جناب آغا فاضل صاحب سکریٹری اور درگاہی مسجد کے امام، پیر سید ضامن نظامی کے بھانجے جناب سید اسلام الدین نظامی صاحب خازن بنائے گئے- سینٹرل بینک آف انڈیا واقع ویسٹ نظام الدین میں جامعہ کا کھاتا کھولا گیا- رقوم حضرت علامہ اور امام سید اسلام الدین نظامی صاحب کے دستخط سے برآمد کی جاتی تھیں، کچھ دنوں کے بعد جب حافظ صاحب بھینسوڑی والے چلے گئے تو فیض العارفین نے اپنے ایک رشتہ دار کو ضلع بلیا سے بلایا، یہ تھے جناب حافظ عبدالکریم صاحب جو نہایت سادہ لوح متقی پرہیز گار تھے- ادارہ کا نظام معمول کے مطابق چلتا رہا، لیکن حافظ صاحب بھی اپنے ضعف ونقاہت کے سبب زیادہ دنوں تک قیام نہ کر سکے- یہاں سے رمضان شریف کے مہینے میں اپنے بچے کے ساتھ پاکستان گئے اور واپس آنے کے کچھ دنوں کے بعد مستعفی ہو کر گھر چلے گئے- پھر حافظ عبدالکریم صاحب کی جگہ پر کرنے کے لیے مولانا اسرارالحق صاب نے بہار سے مولوی سید غلام صادق کو بلوایا- یوں جیسے تیسے یہ ادارہ ضعف تنفس کے ساتھ زندہ رہا- رئیس القلم کے ذہن میں ادارہ کا جو پلان تھا، اس سے اس ادارہ کا تعلیمی معیار بے میل تھا، اس لیے ادارہ بس نام کا رہ گیا تھا- مولانا سید غلام صادق صاحب بہار کے رہنے والے تھے- شاہ قیام الدین اصدق مرحوم یا شاہ بشیرالدین اصدق صاحب کے داماد تھے- آں موصوف بھی محض چند ماہ تدریسی فرائض انجام دے کر ایک میرے نام اور ایک مولانا اسرارالحق کے نام چٹھی لکھ کر ستمبر ۱۹۸۲ء میں اپنے گھر واپس چلے گئے-

جیسا کہ میں نے عرض کیا علامہ ارشدالقادری کے ذہن میں جس عظیم ادارہ کا تصور تھا، اس سے جامعہ حضرت نظام الدین واقع بستی حضرت نظام الدین اولیا کی صورت حال مختلف تھی، اس لیے جامعہ کے لیے مناسب زمین کی تلاش بہت پہلے سے کی جانے لگی تھی-

۱۹۸۱ء میں بہار کے معروف کانگریسی لیڈر محمد یوسف صاحب جو کئی پنچ سالہ ٹرم میں لوک سبھا کے ممبر رہ چکے تھے، تال کٹورہ روڈ کی بلڈنگ نمبر ۱۴ میں رہتے تھے، ان کے توسط سے وٹھل

بھائی پٹیل ہاؤس واقع رفیع مارگ میں تین کمروں پر مشتمل فلیٹ سی/ ۱۰۳ حاصل ہوگیا- مولانا اسرارالحق نے آل انڈیا قومی ایکتا کمیٹی کا اسے دفتر بنالیا- میں اس کمیٹی کا آفس سکریٹری تھا، لہٰذا ہم دونوں اسی فلیٹ میں رہنے لگے اور میں یہیں سے طبیہ کالج جاتا آتا رہا- اتفاق سے ایک دن میری OPD میں محمد شعیب صاحب آئے جن سے میری پہلے سے دید شنید تھی، انہوں نے مجھ سے کہا کہ فاضل پور جوشی کالونی میں سستے داموں زمین مل رہی ہے- اگر آپ چاہیں تو میں زمین کے مالک سے بات کروں، میں نے پوچھا کتنی زمین ہے؟ جواب ملا ہزاروں گز- میں نے شعیب سے کہا کہ دو تین دنوں میں جواب دوں گا- میں جب اپنی قیام پر آیا تو مولانا اسرارالحق صاحب کو زمین کی تفصیلات بتائیں- مولانا نے کہا کہ علامہ ارشد دو تین روز میں دہلی آنے والے ہیں، وہ آجائیں تو ہم موقع معائنہ کرنے چلیں گے- میں نے فون پر شعیب صاحب کو بتا دیا کہ جیسے ہی علامہ دہلی آئیں گے ہم فاضل پور حاضر ہوں گے اور گوجر (مالک اراضی) سے بھی کہئے گا وہ موجود رہے- جیسے ہی علامہ آئے اور انہیں زمین کے بارے میں بتایا گیا فوراً زمین کا موقع معائنہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے- چنانچہ شعیب صاحب کو اپنے آنے کی خبر دے کر ہم تینوں جوشی کالونی روانہ ہوگئے- فاضل پور پہنچنے پر حاشیہ کے لوگوں نے ہمارا استقبال کیا، گوجر بھی موجود تھا، پڑوس والوں کو اس بات کی خوشی تھی کہ جب یہاں دینی ادارہ قائم ہوگا اور بڑے بڑے مسلم زعما یہاں قیام پذیر ہوں گے، ممبران پارلیمنٹ بھی آتے جاتے رہیں گے تو ہماری کالونی بہت جلد ریگولرائز ہوجائے گی- پانی، بجلی اور سیور لائن کے مسائل حل ہوجائیں گے- قصہ کوتاہ زمین پسند آئی- محض بیس ہزار روپے میں ایک ہزار گز زمین کا سودا طے ہوا اور ۱۰ر جنوری ۱۹۸۲ء کو پندرہ روپے کے اسٹامپ پیپر پر جنرل پاور آف اٹارنی حاصل کرلیا گیا، جس کی نقل اس وقت میرے پیش نظر ہے- گواہوں میں ماسٹر علی احمد صاحب کے دستخط بھی ہیں جو ان دنوں الجامعۃ الاشرفیہ جونیئر ہائی اسکول کے پرنسپل ہیں-

فرسٹ پارٹی اراضی کا مالک گوجر تھا اور سیکنڈ پارٹی مولانا اسرارالحق صاحب اور مولانا ارشد القادری صاحب تھے، لیکن کسی مصلحت کی بنا پر مولانا اسرارالحق صاحب نے سیکنڈ پارٹی میں اپنی جگہ اپنے بیٹے کا نام ٹائپ کرادیا- علامہ نے دیکھا کہ اس میں کوئی مصلحت معلوم ہوتی ہے جو مولانا ظاہر نہیں کررہے ہیں لہٰذا علامہ نے بھی انہیں کی مطاوعت کی، یوں پاور آف اٹارنی حاصل

ہونے کے بعد ایک ہزار گز زمین پر سکنڈ پارٹی کا قبضہ ہوگیا اور دو ہفتوں کے اندر زمین کی چہار دیواری کرادی گئی۔

ادھر وسائل کی کمی کی وجہ سے تعمیری کام رکا ہوا تھا اور مولانا اسرار الحق صاحب اپنے مقررہ پروگرام کے تحت روس چلے گئے تھے، ادھر راتوں رات ایک پولس افسر نے مزدوروں کو بلوا کر پورے احاطہ میں پودے لگوا کر عملاً قبضہ کرلیا، یہ پولس افسر اونچے رینک کا تھا، حاشیہ کے لوگوں نے کلیان پور پولس اسٹیشن پہنچ کر زبانی شکایت کی، کوئی شنوائی نہیں ہوئی، علامہ بھی ان دنوں فیض العلوم کے کسی قضیہ کے تصفیہ کے لیے جمشید پور گئے ہوئے تھے، احمد کمال اور مولوی امین الدین فیضی وغیرہ کے درمیان کوئی نزاع تھی، جسے نمٹانا ضروری تھا، بالآخر مولانا اسرار الحق صاحب کو فون پر اس سانحہ کی خبر دی گئی، انہوں نے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے میں تین چار روز میں دہلی پہنچ رہا ہوں، سب ٹھیک ہوجائے گا، مولانا اسرار الحق صاحب آئے تو انہوں نے دس پندرہ مزدوروں کو بلوایا اور حکم دیا کہ سارے پودے اکھاڑ کر پھینک دیے جائیں پھر کوئی سامنے نہیں آیا اور سکنڈ پارٹی کا قبضہ برقرار رہا۔

چونکہ جامعہ کو ایک اعلیٰ تعلیمی مرکز بنانا تھا، اس لیے پاور آف اٹارنی میں اس زمین کے استعمال کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا تھا:

That the above said land will be used for the Social, Educational and Religeous purposes only.

علامہ ان دنوں دہلی سے باہر تھے۔ زمین پر پولس افسر کے قبضہ اور اس کی واگزاری کی خبر انہیں ہوچکی تھی، دہلی آئے تو مولانا (اسرار الحق) سے بڑی گرم جوشی سے ملے، ان کی جرأت و ہمت کی داد دی، لیکن مولانا اپنے خوابوں کی دنیا الگ بسا چکے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر میں سامنے نہ آیا ہوتا تو زمین تو قبضہ سے نکل ہی چکی تھی، اب جو اپنے تصرف میں ہے یہ بلا شرکت غیرے میری وجہ سے ہے، اس لیے اب اس پر کسی اور کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ سوچ کر مولانا نے ایک دن علامہ سے کہا: ''یہ پیسے لیجئے اور زمین کو بھول جایئے''۔ علامہ یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ مولانا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ علامہ نے کہا، ''جو آپ سن رہے ہیں وہی میں کہہ رہا ہوں''۔ مولانا نے جواب دیا۔ یہ سن کر علامہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، کاش یہ سننے سے پہلے میں بہرا

ہو گیا ہوتا۔ اس سانحہ کے بعد اگر چہ بظاہر تعلقات میں تلخی نہیں آئی، لیکن اس کا اثر علامہ کی صحت پر پڑااور وہ ذہنی طور پر ٹوٹ سے گئے، ایک دن میں نے مولانا سے پوچھا کہ زمین تو ایک خاص مقصد کے تحت خریدی گئی تھی، اب آپ کا کیا پلان ہے؟ جواب ملا اپنے کام سے کام رکھو، پھر علامہ کے پاس اس مرگ جواں کا پرسہ دینے گیا، میں نے کہا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے، علامہ نے کہا کہ اب زمین کو بھول جانا چاہیے، ہم پولس افسر سے اپنی زمین چھین سکتے تھے، یہ ہمارے لیے مشکل کام نہیں تھا، لیکن ہم میں مولانا سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے-

اس کے باوجود علامہ نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے منصوبے کو روبہ عمل لانے کے لیے مناسب زمین کی تلاش جاری رکھی- غالباً انہیں ایام میں جمشید پور میں ایک وقف کی زمین پر ٹاٹا کا قبضہ بھی وہاں کے مسلمانوں کے لیے دردسر بنا ہوا تھا، اس جائداد کو واگزار کرانے کے لیے وہاں کے ذی اثر مسلمانوں کے تعاون سے بہار کے چیف منسٹر شری جگن ناتھ مشرا کے نام ایک میمورنڈم تیار کرلیا گیا تھا- حسن اتفاق کہ علامہ دہلی میں تھے، جمشید پور سے خبر ملی کہ چیف منسٹر دہلی گئے ہوئے ہیں، علامہ نے بہار بھون سے اس کی تصدیق کرانے کے بعد مجھے فون پر حکم دیا کہ آج شب میں ۸ / بجے بہار بھون جانا ہے، تم ۷ بجے مولانا اسرارالحق صاحب کی کوٹھی (واقع کو پرنکس مارگ) پر آجاؤ، میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا- وہاں سے ہم ٹھیک ۸ / بجے شب میں بہار بھون پہنچے، معلوم ہوا کہ صاحب کسی کی شادی اٹنڈ کرنے گئے ہیں، واپسی تقریباً ۱۱ / بجے ہوگی، علامہ نے مجھ سے کہا کہ موقع اچھا ہے جتنی دیر ہوگی اس کا ان شاء اللہ فائدہ ہم کو پہنچے گا، پھر علامہ ایک بہاری افسر سے گفتگو کرنے لگے اور میں لان میں گھاس پر لیٹ گیا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، نیند آ گئی- تقریباً ۱۲ بجے علامہ نے مجھے جگا کر کہا کہ پانچ منٹ میں سی ایم پہنچنے والے ہیں، میں ہاتھ منھ دھوکر جیسے ہی فارغ ہوا چیف منسٹر کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوگئی، جگن ناتھ مشرا نے گاڑی سے اترتے ہی علامہ کو دیکھ لیا تھا، بڑھ کر خود ہاتھ ملایا اور حیرت سے پوچھا کہ اتنی رات گئے آپ یہاں کیسے؟ علامہ نے کہا کہ کام ہی ایسا آن پڑا ہے کہ میرے لیے ۱۲ / بجے رات کے اور ۱۲ / بجے دن کے دونوں برابر ہیں- پھر سی ایم کے ساتھ ہم روم میں داخل ہوئے، چائے بسکٹ سے ضیافت ہوئی، اب سی ایم علامہ سے مخاطب ہوئے، ہاں تو مولانا صاحب کیا بات ہے، جس کے لیے آپ نے اتنی رات میں زحمت کی ہے؟

علامہ نے اٹیچی سے پیپر نکالا اور سی ایم کے آگے میز پر رکھ دیا- سی ایم نے کہا مولانا صاحب جب آپ خود موجود ہیں تو میں پیپر پڑھ کر کیا کروں گا، آپ بتایئے کیا بات ہے- علامہ نے دو تین منٹ میں وقف کی زمین کا پورا قصہ سنا دیا اور کہا کہ اس وقف کی زمین پر مسلمانوں کا حق ہے، مخالف پارٹی کو حکم دیا جائے کہ وہ اس زمین سے دست بردار ہو جائے، یہ سن کر چیف منسٹر نے جیب سے قلم نکالا اور پیپر پر کچھ لکھ کر علامہ کو پیپر واپس کرتے ہوئے کہا کہ جایئے آپ کا کام ہو جائے گا، یہ سن کر علامہ کی خوشی کا حال نہ پوچھئے، جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو-

سی ایم سے رخصت ہو کر ہم شاہراہ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے، رات کے ڈیڑھ بج چکے تھے، علامہ نے کہا کہ اس وقت میں اتنا خوش ہوں کہ اگر یہاں سے کو پرنکس مارگ تک ہوائی جہاز سے جانا ممکن ہوتا تو میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا، ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے کھڑے میں نے کہا کہ حضرت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، جمشید پور کا میٹر، وقف کی زمین، ٹاٹا کا قبضہ، اتنا غیر معمولی مسئلہ بہار بھون میں بیٹھ کر کیسے سلجھایا جا سکتا ہے؟ علامہ نے کہا چیف منسٹر نے آرڈر کر دیا ہے، یہ بہار بھون میں بیٹھ کر کیا یا سی ایم آفس میں بیٹھ کر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، پھر تم نے مشرا جی کی زبان سے بھی تو سنا کہ جایئے آپ کا کام ہو جائے گا- بات ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک ٹیکسی آتی نظر آئی، ہاتھ کے اشارے سے روکا گیا، اس کو منھ مانگا دام دیا گیا، ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اندر کی لائٹ آن کر دو، لائٹ آن ہو گئی، میں نے علامہ کے ہاتھ سے پیپر لے کر چیف منسٹر کی تحریر پڑھی، انہوں نے بہار کے چیف سکریٹری کو لکھا تھا: Pl. enquire & report immediately

اس کے بعد کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں ہے- چند ماہ پیشتر بدایوں شریف سے واپسی میں میں نے عزیز ذوالقدر مولانا خوشتر نورانی کو جب یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا کہ وہ زمین مسلمانوں کے تصرف میں ہے- منڈاولی کی زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد علامہ نے پھر کبھی ادھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا، لیکن جس اہم دینی کام کے لیے علامہ کے ذہن میں ایک عظیم منصوبہ تھا، اس کو روبہ عمل لانے سے غافل بھی نہیں تھے، کچھ برسوں کے بعد ذاکر نگر میں زمین کی نشاندہی ہوئی، پسند آئی اور حاصل کر لی گئی-

اگر چہ یہ عمارت چہار منزلہ ہے، لیکن علامہ کے ذہن میں جو منصوبہ تھا جس کی ایک جھلک

''اسلام کے داعیوں کے لیے اپنی نوعیت کی پہلی تربیت گاہ'' میں دیکھی جا سکتی ہے- کتابچہ پڑھ کر آنکھیں بند کر کے سوچیے پردۂ ذہن پر جن وسیع وعریض عمارات کا سلسلہ نظر آئے گا، اس کا موجودہ جامعہ عشر عشیر بھی نہیں ہے، اس لیے اس کے باوجود وہاں ایک ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جوان کے خواب کی حسین تعبیر بن سکے- اس مقصد کے حصول کے لیے علامہ نے گورنمنٹ آف انڈیا سے بھی رابطہ کیا، ان کو پتہ تھا کہ دہلی میں ہزاروں ایکڑ زمین بعض مذاہب کو چند قیود وشرائط کے ساتھ الاٹ کی گئی ہے، پھر اس سے ہم کیوں نہ فائدہ اٹھائیں- علامہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ ہم کانگریس پارٹی کے گئے وقت میں کام آ چکے ہیں، اگر ارکان حکومت چاہیں تو ہم بھی اپنا ٹارگٹ حاصل کر سکتے ہیں-

کانگریس پارٹی پر احسان کی بات آئی تو ایک واقعہ بھی سن لیجئے- ۱۹۸۰ء کا الیکشن ہونے والا تھا- مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی جو کانگریس کے ٹکٹ پر ایک پنج سالہ ممبر پارلیمنٹ رہ چکے تھے، اب چرن سنگھ کی پارٹی جوائن کر لی تھی، امیٹھی حلقہ کوک سبھا سے اپنی امیدواری کا اعلان کر دیا تھا- اسی حلقہ سے اندرا گاندھی کے سپوت سنجے گاندھی بھی امیدوار تھے، مولانا اسرارالحق اور علامہ نے مل کر پلان بنایا کہ اندرا جی سے ملاقات کر کے ان سے کہا جائے کہ امیٹھی کے مسلمانوں کی اکثریت کچھوچھہ شریف سے عقیدت رکھتی ہے- مولانا مظفر حسین کچھوچھوی کے میدان میں آنے کے بعد وہاں کے مسلمان بڑی تعداد میں مولانا کچھوچھوی کے ساتھ ہوں گے- اگرچہ جیتنے کا امکان کم ہے، لیکن وہ مسلمانوں کا اتنا ووٹ حاصل کر لیں گے کہ سنجے گاندھی کی جیت مشتبہ ہو جائے گی- یہ پلان کیا اور اندرا جی کے یہاں پہنچ گئے- اندرا جی نے یہ سب کچھ سننے کے بعد کہا کہ یہ تو میرے لیے بری خبر ہے، اس کا کوئی حل ڈھونڈیے، مولانا اسرارالحق صاحب نے کہا کہ اگر مولانا مظفر میاں کو کانگریس ٹکٹ دے کر کسی اور حلقہ سے امیدوار بنائیے تو بات بن سکتی ہے، اندرا جی نے کہا کہ مگر مولانا کچھوچھوی تو دوسری پارٹی میں ہیں، جب تک وہ اپنی پارٹی سے استعفیٰ نہیں دیں گے، ہم اپنی پارٹی میں کیسے شامل کر سکتے ہیں؟ مولانا اسرارالحق نے کہا کہ ہم ان سے ہاتھ جوڑ کر آئے ہیں کہ اگر آپ کو کانگریس ٹکٹ دے تو آپ بی کے ڈی چھوڑ کر کانگریس جوائن کر لیں- اندرا جی نے کہا کہ آپ ایک دو دن میں کوئی حتمی فیصلہ کر کے آیئے اور ممکن ہو تو مولانا کچھوچھوی کو بھی لایئے، اس کے بعد ہم اپنا فیصلہ سنا دیں گے-

قصہ مختصر! مولانا مظفر میاں نے بی کے ڈی سے استعفیٰ دیا، کانگریس پارٹی جوائن کی اور بہرائچ لوک سبھا کے حلقہ سے اندرا جی نے مولانا کچھوچھوی کو کانگریس کا امیدوار بنالیا- نتیجہ کار شری سنجے گاندھی امیٹھی سے جیتے اور مولانا مظفر حسین کچھوچھوی بہرائچ سے-

مولانا اسرارالحق اور علامہ کا کانگریس پارٹی پر یہ زبردست احسان تھا، جس کا فائدہ مولانا اسرارالحق نے خوب خوب اٹھایا- علامہ نے جب اسلام کے داعیوں کے لیے تربیت گاہ کا پلان بنایا اس وقت اندرا جی آنجہانی ہوچکی تھیں، تاہم سنجے گاندھی، گیانی ذیل سنگھ، پی سی سیٹھی، نرسمہا راؤ وغیرہ پارٹی اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو حقیقت حال کا پورا علم تھا- چنانچہ جب نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہوئے تو امید کی کرن نظر آئی اور ایسا لگا کہ ضرورت کے مطابق رقبۂ زمین حاصل ہوجائے گا- دہلی ہائی کورٹ کے قرب میں ایک زمین کی نشاندہی بھی ہوئی تھی، اس دوران علامہ نے کانگریس پارٹی اور حکومت پر یہ واضح کرنا چاہا کہ ہمارے ساتھ معاملت کر کے نہ پارٹی گھاٹے میں رہے گی نہ حکومت- چنانچہ ۱۹۹۵ء میں ایک عظیم کانفرنس کی تیاری شروع ہوئی- علامہ نے دہلی کے علماء و مشائخ، ائمہ مساجد اور سنی تنظیموں کے سربراہوں سے رابطہ شروع کیا اور رام لیلا گراؤنڈ میں کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کردیا-

ایک دن میں نے علامہ سے کہا کہ حضرت رام لیلا میدان بہت بڑا ہے، اتنے افراد کہاں سے آئیں گے کہ میدان بھرا ہوا معلوم ہو، علامہ نے کہا کہ میں سیوان وغیرہ میں بڑی بڑی کانفرنسیں کر چکا ہوں، تم فکر نہ کرو، مگر میں مطمئن نہیں ہوا- میں نے کہا کہ انور دہلوی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ جب آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کا رام لیلا میدان میں بھاشن ہونے والا تھا تو پارٹی کے ذمہ داروں میں سے کسی نے کہا تھا کہ رام لیلا میدان بہت بڑا ہے- پنڈت جی ہندوستان کے ہیرو ہیں، یہ سچ ہے لیکن رام لیلا میدان کا پیٹ ان کے نام پر نہیں بھرا جاسکتا- پھر انہیں میں سے کسی نے کہا کہ آج کل بمبئی میں دلیپ کمار کا بڑا جلوہ ہے، بڑی مقبولیت ہے، اگر ان کو بلالیا جائے تو سیاسی ہیرو اور فلمی ہیرو دونوں کے نام پر ازدحام خلائق ہوجائے گا، لیکن علامہ کو یقین تھا کہ افراد کی کمی نہیں ہوگی اور مجھے یہ کہہ کر خاموش کردیتے کہ یہ موضوع میرا ہے تمہارا نہیں، تم جاکر قاموس اور صحاح کا مطالعہ کرو-

۱۹۹۹ء کی بات ہے ممبئی میں مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کے اعزاز میں رضا اکیڈمی

نے جشن شارح بخاری کا اہتمام کیا تھا، موصوف کو ان کی خدمات کے اعتراف میں چاندی سے تولنے کا اعلان بھی ہوا تھا- مجھے بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی، بلکہ اسٹیج پر جب مفتی صاحب کو ترازو کے ایک پلہ میں بٹھایا گیا تو دوسرے پلہ میزان میں چاندی کی پانچویں سل اسی حقیر کے گنہ گار ہاتھوں نے رکھی تھی-

مفتی صاحب ہمارے اشرفیہ کے صف اول کے ابنائے قدیم سے تھے، جامعہ کے ناظم تعلیمات اور صدر شعبۂ دارالافتا کی حیثیت سے ان کی عظیم خدمات تھیں، شارح بخاری تھے، ایک دن اسی غور وفکر میں تھا کہ یک دل نے کہا مفتی صاحب فقیہ اعظم کے خطاب کے حق دار ہیں، اسی وقت میں نے مشورہ کے لیے حضرت رئیس القلم سے رابطہ کرنا چاہا، لیکن وہ دہلی میں موجود نہیں تھے، پھر میں نے اپنی صواب دید پر ''فقیہ اعظم'' کے خطاب کی تجویز کا ڈرافٹ تیار کیا، رضوی کتاب گھر میں کمپوز کرایا اور سیدھا مفتی اعظم دہلی حضرت مولانا محمد میاں ثمر دہلوی کے در دولت پر پہنچا، مفتی صاحب نے تحریر ملاحظہ فرمانے کے بعد کہا میرا مشورہ ہے کہ فقیہ اعظم کے ساتھ ''ہند'' کا اضافہ کر دیا جائے، دنیا بہت بڑی ہے، خدانخواستہ کسی کی حق تلفی ہو، میں نے اسی وقت قلم سے ''ہند'' کا اضافہ کر دیا، مفتی صاحب نے میری تجویز کی تائید ان لفظوں میں فرمائی: ''فقیر اس حقیقت کا معترف اور اس تجویز سے متفق ہے کہ حضرت ممدوح کو فقیہ اعظم ہند کے خطاب سے سرفراز کیا جائے-'' کچھ دنوں کے بعد ایڈیٹر ماہنامہ کنز الایمان نے خبر دی کہ علامہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا میں تشریف فرما ہیں اور شاید آج ہی رات کی کسی فلائٹ سے ہالینڈ یا انگلینڈ جانے والے ہیں، میں اسی وقت مٹیا محل جامع مسجد سے ذاکر نگر کے لیے روانہ ہو گیا، جامعہ میں علامہ سے ملاقات ہوئی، عشائیہ ہوا، بعد نماز عشا میں نے تجویز کی کاپی سامنے رکھی، علامہ نے سرسری نظر ڈالی، کچھ تاثر ظاہر کیے بغیر دیگر حاضر باشوں کی طرف روئے سخن کر لیا، کچھ دیر توقف کے بعد میں نے پھر توجہ دلائی، علامہ نے دوبارہ نظر ڈالی اور کچھ تاثر ظاہر کیے بغیر دوسروں سے گفتگو کرنے لگے- میں سراپا حیرت کہ آخر ماجرا کیا ہے، ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، ادھر میں پس و پیش میں، ادھر علامہ کے چہرے سے بھی ظاہر تھا کہ وہ پس و پیش میں ہیں، بالآخر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ حضرت نیک کام میں دیر کیا ہے، یہ قلم حاضر ہے تائید فرما کر دستخط کر دیجیے- یہ سن کر علامہ نے سر جھکا یا جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں، چند لمحے کے بعد سر اٹھاتے ہوئے کہا کہ

میں اس تجویز کی تصدیق بھی کرتا ہوں توثیق بھی۔

رئیس القلم سے یہ چند گھنٹوں کی ملاقات پچھلی تمام ملاقاتوں سے مختلف تھی، میں نے محسوس کیا کہ اس تجویز کے تعلق سے علامہ کے دل و دماغ میں باہم توافق نہیں ہے، کچھ شواہد بھی میرے احساس کی تائید کر رہے تھے، لیکن شاید یہ میری غلط فہمی تھی۔ جب علامہ برطانیہ سے واپس آئے تو ایک ملاقات میں میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ میری تجویز کی تائید کرنے میں آپ نے اس قدر فکر و تامل سے کیوں کام لیا، تو حضرت رئیس القلم نے جو مناظر اہل سنت کے خطاب سے بھی شہرت رکھتے ہیں جواب دیا کہ جب میں نے تجویز کے الفاظ پڑھے اور ''فقیہ اعظم ہند'' کے خطاب پر نظر گئی تو میں عالم خیال میں پورے ہندوستان کے علما و فقہا کی ڈیوڑھیوں کی خاک چھانتا رہا کہ کسی حق دار کی حق تلفی تو نہیں ہو رہی ہے، جب ہر طرف سے مطمئن ہوا تو میں نے تصدیق بھی کر دی، توثیق بھی کر دی۔

رئیس القلم علیہ الرحمہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں تھے، لیکن سیاست حاضرہ سے غافل بھی نہیں تھے، ملکی سیاسی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے، جس سے مسلم امہ کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی، گرم لوہے پر چوٹ مارنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا، جب مولانا اسرار الحق صاحب کانگریس پارٹی کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے تو کوپرنکس مارگ پر کوٹھی الاٹ ہونے سے پہلے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ہی قیام پذیر رہے، علامہ دہلی آتے تو یہیں قیام کرتے۔حسن اتفاق کہ مولانا اسرار الحق کے ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے کے کچھ دنوں کے بعد اتر پردیش اسمبلی کے لیے جنرل الیکشن کا اعلان ہو گیا، ان دنوں یہ شہرہ تھا کہ مولانا اسرار الحق صاحب کے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے بڑے گہرے روابط ہیں، یوپی الیکشن میں کانگریس پارٹی سے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں گونڈہ بستی وغیرہ اضلاع کے کانگریسی نیتاؤں کی بھیڑ لگ گئی۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ مولانا جس پر مہربان ہو جائیں گے، اس کا بیڑا پار ہو جائے گا، خود مولانا کو بھی یہ خوش گمانی تھی کہ دس بیس حلقہائے انتخاب کے ٹکٹ گویا ان کی جیب میں ہیں، ان دنوں ہمارے فلیٹ کا ہال مہمان خانہ بن گیا تھا۔ خورد و نوش وغیرہ کے معاملے میں سارے مہمان ہی میزبان ہوا کرتے تھے، اسی دوران مبارک پور سے شری لالسا رائے بھی آ گئے، یہ مبارک پور کے قریب سٹھیاؤں کے ڈگری کالج کے منیجر تھے۔ حاجی غلام نبی اشرفی سابق چیئرمین ٹاؤن ایریا مبارک پور کے ساتھیوں میں تھے۔ ہماری

جماعت کے ہمدرد تھے- میں انہیں جانتا تھا، یہ مجھے نہیں جانتے تھے- اس وقت میں دفتر میں تنہا تھا- لالسارائے نے مجھ سے پوچھا آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا آفس سکریٹری ہوں، پھر علامہ کے بارے میں پوچھا میں نے کہا وہ کہیں گئے ہوئے ہیں- دیر رات تک آئیں گے، جب انہیں علامہ سے ملاقات نہ ہونے کا اندازہ ہوگیا تو مجھ سے کہا کہ مولانا صاحب کو یہ دو فائلیں دے دیجیے گا، ان میں سے ایک شریمتی اندرا گاندھی کے لیے ہے، دوسری شری سنجے گاندھی کے لیے، اس کے بعد مجھے اس کی قدرے تفصیل بتائی کہ کچھ دنوں پہلے جب مولانا قادری صاحب مبارک پور آئے تھے تو ہم ان سے ملے تھے، ہمارے ساتھیوں نے میری سیاسی اور جماعتی خدمات کے بارے میں انہیں بتادیا تھا، قصبہ کے کچھ ذمہ داروں نے مولانا صاحب سے کہا تھا کہ اگر کانگریس پارٹی سے ٹکٹ مل جائے تو یہ ادارہ کے لیے اور جماعت کے لیے بہت کام آئیں گے، اسی لیے مولانا صاحب نے مجھ سے کچھ معلومات طلب کی تھیں، جو اس کاپی پر درج ہیں، یہ کہہ کر لالسارائے نے ایک کاپی علامہ کے نام کی میرے حوالے کی، اس میں علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ رقعہ بھی تھا، جس کے ذریعہ حلقۂ انتخاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد اور برہمن، ہریجن، یادو وغیرہ کی علاحدہ علاحدہ تعداد مطلوب تھی- لالسارائے کے جانے کے بعد مبارک پور قاضی گھرانے کے حاجی محمد صدیق صاحب آئے، یہ بھی چاہتے تھے کہ مولانا اسرارالحق صاحب اندراجی سے میرے نام کی سفارش کردیں، جب رات میں علامہ آئے تو میں نے لالسارائے کی آمد کا ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ ہاں کچھ دن پہلے جب میں مبارک پور حاضر ہوا تھا تو وہاں کے ذمہ داروں نے لالسارائے کا تعارف کرایا تھا- اشرفیہ اور جماعت کے حوالے سے ان کا ذکر خیر کیا تھا، اسی لیے میں نے ان کو دہلی بلایا تھا اور حلقہ کے ووٹروں کی تفصیلات طلب کی تھی، دوسرے روز علامہ نے مولانا اسرارالحق سے کہا کہ ایک امیدوار مبارک پور سے آیا، یہ میرا کنڈیڈیٹ ہے، مبارک پور کے اہل سنت کا خیر خواہ ہے، اشرفیہ کا ہمدرد ہے، جہاں آپ اور امیدواروں کو ٹکٹ دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں، یہ ایک کام جماعتی مفاد میں ضرور کردیں- خدا کی شان ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا، یہ خبر گشت کرنے لگی کہ اترپردیش کانگریس ادھیکش کے خلاف شکایتیں موصول ہونے کے بعد اندراجی نے انہیں جملہ کاغذات کے ساتھ دہلی طلب کرلیا اور سارا ریکارڈ اپنی تحویل میں لے کر الٹے پاؤں واپس کردیا ہے، یہی نہیں بلکہ یہ بھی ہوا کہ اس کے بعد ماں بیٹے ایسا انڈر گراؤنڈ ہوئے کہ بڑے بڑے کانگریسی نیتاؤں کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہوگیا، جب

اتر پردیش کی پارٹی امیدواروں کی لسٹ فائنل ہوگئی، اس کے بعد اندراجی پارٹی کے مرکزی دفتر میں آئیں-مولانا اسرارالحق صاحب ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہ گئے-

میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ حضور حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک موقع پر علامہ ارشد کو چاندی سے تولنے کی آرزو کی تھی، جو استعارے اور کنائے کی حقیقت سے واقف ہیں، انہیں خوب پتہ ہے کہ یہ کہہ کر حافظ ملت نے علامہ ارشد کو لعل و یاقوت سے تول دیا-چاندی سے تول کر علامہ کی قدر (Value) کا تعین مقصود نہیں تھا، یہیں سے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی حقیقت کے متعذر نہ ہوتے ہوئے بھی معنی مجازی اور عرف کو تقدم حاصل ہوتا ہے-

کاروان رئیس القلم کے ایک شمارہ میں رئیس القلم کے تعلق سے یہ عبارت نظر سے گزری:
''جب وہ اشرفیہ آتے، اساتذہ، انتظامیہ حرکت میں آجاتی، تدریسی وغیر تدریسی عملہ چاق و چوبند ہوجاتا-'' اس طرح کی عبارت آرائی سے رئیس القلم کا قد اونچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے-کسی معزز شخصیت کی تعریف وتوصیف دوسرے معززین کی توہین وتذلیل پر منتج ہو، اس سے احتراز کرنا چاہیے-

رئیس القلم علامہ ارشد القادری کا انتقال دہلی میں ہوا، تفتیشی رپورٹ کے مطابق دونوں گردے معطل ہوچکے تھے، دہلی میں سب سے پہلے آپ کو ملہوترا ہارٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی میں ایڈمٹ کیا گیا، افاقہ کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو مول چند ہاسپٹل دہلی منتقل کیے گئے، جہاں ڈائلیسس کا معقول انتظام تھا، لیکن بیماری اس مصنوعی عمل کے قابو سے باہر ہوچکی تھی، پھر وہاں سے آپ کو ایمس AIIMS لے جایا گیا، لیکن ایمس میں علاج کی نوبت نہیں آئی وہیں ۲۹ اپریل ۲۰۰۲ء کو شام ۴ر بج کر ۳۵ منٹ پر واصل بحق ہوگئے-اناللہ وانا الیہ راجعون-

سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ (جو غالباً امریکہ کا ویزا حاصل کرنے دہلی آئے ہوئے تھے) اور علامہ کے صاحبزادے جناب غلام ربانی صاحب میت کے ساتھ جھارکھنڈ گئے، جمشید پور میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا، ہوائی جہاز سے نعش کو بھیجنے کا انتظام سابق مرکزی وزیر جناب الحاج سی ایم ابراہیم صاحب نے کیا تھا-

(ماہنامہ جام نور از جون تا اگست ۲۰۱۰ء)

شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں

بالائے سرش ز ہوشمندی

۴؍جولائی ۲۰۱۰ء کو تقریباً اڑتالیس برس کے بعد فون پر میری گفتگو ایک ایسے المعی و لوذعی بزرگ سے ہوئی جو شیخ الاسلام، مفسر قرآن اور رئیس المحققین جیسے القاب وخطابات سے یاد کیے جاتے ہیں، جن کو ہم دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے زمانہ طالب علمی میں ''مدنی میاں'' کہتے تھے- آج بھی میری زبان اسی مختصر سے نام سے شادکام ہے اور میں اپنی یادوں کی پرتیں اسی نام سے کھولنا پسند کروں گا- جن لوگوں نے شیخ الاسلام اور مفسر قرآن والا زمانہ پایا ہے وہ مجھے یہ جان کر معذور سمجھیں کہ میں اس دور کی بات کر رہا ہوں جب یہ خطابات ہنوز آں موصوف کی پیشانی علم وفضل کے نہاں خانے میں محفوظ تھے-

خدا بھلا کرے محترم مولانا قمر احمد اشرفی کا، ۴؍جولائی کو وہ دہلی میں موجود تھے، فون پر گفتگو ہوئی اثناء گفتگو سید التفاسیر کا ذکر آ گیا، میں نے کہا اس کے دوحصوں کی زیارت عزیز گرامی مولانا خوشتر نورانی کے دفتر میں ہوئی ہے، حاصل کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ مولانا قمر نے کہا کہ آپ اپنا پوسٹل ایڈریس ایس ایم ایس کر دیجیے حیدرآباد پہنچ کر دونوں حصے بھجوانے کی صورت نکالوں گا معاً انہوں نے کہا کہ شیخ الاسلام ان دنوں اپنے وطن مالوف کچھوچھا مقدسہ میں ہیں اگر ان سے رابطہ ہوجائے تو اس کی حصولیابی جلد سے جلد ممکن ہوجائے گی، پھر انہوں نے کہا کہ آپ میرے فون کا انتظار کیجیے- تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے کہا کہ شیخ الاسلام کا موبائل نمبر ایس ایم ایس کر رہا ہوں، آپ ان سے بات کر لیجیے وہ آپ کے فون کا انتظار کر رہے ہیں- میں نے مرسلہ نمبر ڈائل کیا، گھنٹی ہوئی اور پھر وہی آواز وہی طرز تخاطب وہی لہجہ جو میرے حافظہ میں محفوظ تھا، فردوس گوش بن گیا، مجھے بالکل ہوش نہیں رہا کہ میں ایک ایسی

شخصیت سے ہم کلام ہوں، جس کے آگے بالاؤں کی بالائی اور داراؤں کی دارائی سرنگوں ہے، علماو مشائخ اور فضلائے وقت جس کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں، مگر میرے لیے زمانہ طالب علمی کی اس فضا سے باہر نکلنے کا کوئی جواز نہیں تھا جو میری علمی و ادبی زندگی سے عبارت تھی- میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ شیخ الاسلام نے بھی اپنے عہد رفتہ کو آواز دے لی تھی اب وہ عالم خیال میں ۶۵ سے زائد کے نہیں، بلکہ ۲۲ سے کم عمر کے تھے، اب کیا کہوں میرا کیا حال تھا:

لب گزیدی ومن از ذوق فتادم مدہوش

باتو ایں کیفیت بادہ ندانم کہ چہ کرد

ورنہ حال دیگراں تو یہ ہے کہ جب منازل ترقی طے کر کے بام عروج پر پہنچ جاتے ہیں تو زمین کی شئ مرئی بہت چھوٹی نظر آنے لگتی ہے- میرا برسوں کا ساتھ ایک ایسے قائد ملت سے رہا ہے جو پارلیمنٹ کے رکن کیا ہوئے، انہیں ہر کس و ناکس بونا نظر آنے لگا، ایک دن انہیں کے حسب حال یہ دوشعر ارتجالاً کہہ کر میں ان کی میز پر رکھ آیا:

ہم بہت چھوٹے نظر آنے لگے

اتنا اونچا آپ کا سر ہوگیا

بڑھتے بڑھتے اک طلسم معصیت

قدآدم کے برابر ہوگیا

سنا تھا کہ مولانا نے ان اشعار کا مخاطب کسی اور کو سمجھ کر خوب خوب دادسخن دی تھیں-

ہاں تو میں نے مدنی میاں سے کہا کہ جام نور میں میری تحریریں چھپتی رہتی ہیں، ممکن ہے کبھی کبھی آپ کی نظر سے......ابھی جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ارشاد ہوا ''ممکن نہیں واقع ہے اور کبھی کبھی نہیں یہی ایک رسالہ ہے جسے میں اول سے آخر تک پڑھتا ہوں-'' پہلے جملے میں میرے لفظ ''ممکن'' کو انہوں نے ''واقع'' سے بدل کر جو معنویت پیدا کر دی اس کی بلاغت کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے ذہنوں میں ممکن ممتنع اور واجب کی اصطلاح محفوظ ہوگی، ممکن کے دونوں برابر کے پہلوؤں میں لفظ ''واقع'' نے جو ایک طرف کا پلہ جھکا دیا ہے اور صرف چار حرفی لفظ (واقع) نے شر رمصباحی کی جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے لیے اس بندۂ آثم کے پاس

تشکر کے الفاظ نہیں ہیں اور دوسرے جملے نے تو ماہنامہ جام نور کی مقبولیت اور معتبریت پر گویا مہر لگا دی ہے۔

آگے ارشاد ہوا "ماشاء اللہ آپ نے بہت ترقی کی ہے۔" یہ جملہ سن کر میری آنکھ بھر آئی کاش اس کی جگہ حضرت نے دعائیہ جملہ استعمال کیا ہوتا جو میری ترقی کا ضامن ہوتا۔ کہاں مدنی میاں، حضور محدث اعظم کی تربیت، حضور حافظ ملت کی خصوصی توجہ اور اپنی سعی مشکور سے شیخ الاسلام والمسلمین کے عرش پر متمکن اور کہاں شرر مصباحی، خاک افتادہ، علائق دنیا میں گرفتار کبھی دم بھر کر جست لگانے کی جرأت بھی کی تو نتیجہ معلوم:

دی سرو بقد تو تحشم می کرد
تقلید قد تو پیش مردم می کرد
شد تند نسیم، لالہ سر جنبانید
خندید گل و غنچہ تبسم می کرد

سید التفاسیر کا ذکر آیا تو ارشاد ہوا "مبارک پور سے کوئی کچھوچھہ آئے تو ہاتھ کے ہاتھ لے جائے اور لکھنؤ سے حاصل کرنے میں سہولت ہو تو عربی میاں کے یہاں بھجوا دوں۔" ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی ملی کی سید التفاسیر کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں۔

ہاں تو میں طالب علمی کے دور کی بات کر رہا تھا، مدنی میاں ہم سے ایک جماعت اوپر کے طالب علم تھے، ان کی جماعت کے دیگر ذہین طلبہ میں (مولانا) مشہود رضا خان ابن شیر بیشۂ اہل سنت اور (مولانا) محمد نعمان خاں وغیرہ تھے اور میں (مولانا) ثناء المصطفیٰ امجدی ابن صدر الشریعہ اور (مولانا) عبدالقدوس مصباحی وغیرہ کا ہم سبق تھا، مدنی میاں اپنی جماعت کے طلبہ میں کئی اعتبار سے منفرد تھے، کم گو تھے، کام سے کام رکھتے تھے، طلبہ کے باہمی مناقشات سے دور رہتے تھے، اپنے کمرے میں دیوار پر اپنے مشاغل کا نظام الاوقات چسپاں کر رکھا تھا، جس پر وہ سختی سے عامل تھے، اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ دوسرے طلبہ ان اوقات میں تضیع اوقات نہیں کرتے تھے، بلکہ گمان غالب ہے کہ اسی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کی گئی تھی، مدرسہ کے اوقات درس سے فارغ ہو کر ہم بالعموم مولانا شمس الحق صاحب

(استاذ فارسی) کی درسگاہ میں جمع ہوتے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، طبعی مناسبت کی وجہ سے میں انہیں حضرات کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا- مشہود رضا خان اور نعمان خاں کے مزاج میں حدت تھی، ایک دن نعمان خاں نے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی کی تحریروں میں جو فصاحت، سلاست اور روانی ہے وہ اعلیٰ حضرت کی تحریروں میں نہیں ہے، یہ سننا تھا کہ مشہود رضا خاں آپے سے باہر ہو گئے، آسمان سر پر اٹھا لیا، بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا، انہیں کے ساتھیوں میں صبیحہ ضلع بارہ بنکی کے قاری شبیر احمد تھے، بالکل گائے تھے، مدنی میاں وغیرہ جب مزاحیہ موڈ میں ہوتے تو یہی حضرت تختۂ مشق بنتے، مگر کبھی خفگی کے آثار ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتے-

ایک دن نعمان خان نے کہا، علامہ اقبال سہیل کا کلام ہر اعتبار سے اصغر گونڈوی کے کلام سے فصیح و بلیغ ہے- میں نعمان خاں کی بات سے متفق نہیں تھا، بحث ہوتی رہی معاملہ علامہ نیاز فتحپوری کے کورٹ میں پہنچا، یہ خط میری تحریر میں نعمان خاں کا ڈکٹیٹ کرایا ہوا تھا، ہفتہ عشرہ کے بعد نیاز صاحب نے اسی خط کو اس ریمارک کے ساتھ واپس کر دیا کہ اقبال سہیل اصغر گونڈوی سے زیادہ پڑھے لکھے تھے لیکن اصغر گونڈوی کے کلام میں سہیل سے زیادہ تغزل پایا جاتا ہے، یہ خط میرے پاس محفوظ ہے- نعمان خاں زمانۂ طالب علمی میں بڑے گرم جوش تھے، اپنے گروپ کے لیڈر تھے- وقت گزرتا گیا، ان میں تبدیلیاں آتی گئیں، سئیات حسنات میں تبدیل ہوتے رہے اور آخر عمر میں تو کہا جاتا ہے کہ وہ مرتبہ ولایت پر فائز ہو گئے تھے، رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ- یہی حال میرے ہم سبق (مولانا) ثناء المصطفیٰ کا بھی تھا وقت کے ساتھ ساتھ نیک سے نیک تر ہوتے گئے- تقویٰ شعار دنیا بیزار، رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ-

ہمارے دور طالب علمی میں ہر جمعرات کو نماز عشاء کے بعد مشقی جلسہ ہوا کرتا تھا تا کہ طلبہ کی جھجھک دور ہو اور خطابت میں ملکہ پیدا ہو، یہ پروگرام اشرفیہ کے کسی نہ کسی استاذ کی نگرانی میں ہوتا تھا- جہاں تک مجھے یاد ہے مدنی میاں نے کسی ایک پروگرام میں بھی حصہ نہیں لیا- کبھی شرکت بھی کی تو شدت سعال وغیرہ کا عذر کر کے بیٹھ رہے، قاری محمد یحییٰ صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو انہیں بڑا دکھ ہوا، حضور محدث اعظم سالانہ جلسہ میں تشریف لائے تو قاری صاحب نے ان سے عرض کیا کہ حضور ایک بات کہنا چاہتا ہوں اسے شکایت پر محمول نہ فرمائیں، محدث اعظم نے

فرمایا کہئے، شکایت بھی ہوگی تو سنی جائے گی، قاری صاحب نے عرض کیا کہ شہزادے مشقی جلسہ میں شرکت نہیں کرتے جس کا مجھے دکھ ہے- محدث اعظم نے فرمایا: ''میاں مچھلی کے بچے کو تیرنا نہیں سکھاتے-'' آج جب میں اس جملے کو یاد کرتا ہوں تو محدث اعظم کا یہ قول پیش گوئی کی صورت میں نظر آتا ہے- دنیا جانتی ہے کہ اشرفیہ سے فراغت کے بعد مدنی میاں نے اپنی خطابت کا لوہا بڑے بڑے سحبان وقت سے منوالیا-

مدنی میاں زمانۂ طالب علمی میں بھی شعر وسخن کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے- مبارک پور کے مشاعروں میں بالخصوص بکھری کی بزم مقاصدہ میں اکثر اپنا کلام پڑھواتے تھے، یہ مقاصدہ طرحی ہوتا تھا، حضرت مولیٰ علی کے یوم پیدائش ۱۳ ؍رجب کے موقع پر یہ بزم حکیم عبدالمجید کی نگرانی میں منعقد ہوتی تھی، مدنی میاں کا کلام سید احمد حسین کوثر (برادر خورد اشرف العلما) اور میرا کلام سید رئیس احمد (جو ان دنوں رائے پور میں ہیں) یا نذیر احمد قوال مبارکپوری پڑھتے تھے، احیاء العلوم مکتب فکر کے مولانا محمد عثمان ساحر مبارک پوری کا کلام امتیاز احمد اعظمی (جو ساغر اعظمی کے نام سے شہرت کے حامل ہوئے) پڑھتے تھے، ایک سال کا مصرع طرح تھا:

دل مرا شمع رخ حیدر کا پروانہ بنا

اس بزم مقاصدہ کا سہرا مدنی میاں کے سر رہا، ان دنوں سب سے زیادہ توجہ تضمین پر دی جاتی تھی، مجھے مدنی میاں کی تضمین یاد نہیں رہی، اتنا یاد ہے کہ موضع املو کے میر صاحب جو غالب کے نوحہ گر (مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں) کی طرح داد گر تھے، وہ شعر سن کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر گلا پھاڑ کر داد دیتے ہوئے اسٹیج کی طرف کھسکتے جاتے، حاضرین ان سے اچھی طرح واقف تھے، ان کے لیے طوعاً یا کرہاً گنجائش پیدا کرتے جاتے اور تھوڑی دیر میں وہ اسٹیج کے قریب پہنچ جاتے، اس دن بھی ایسا ہی ہوا، مدنی میاں کا کلام پڑھا جارہا تھا، وہ املو سے آگئے، ایک کنارے بیٹھے رہے اور اچک اچک کر داد دیتے دیتے ابھی کلام ختم نہیں ہوا تھا کہ آپ اسٹیج کے قریب پہنچ گئے-

غالباً ۱۹۵۹ء کی بات ہے میرے خوش عقیدہ پڑوسی جناب محمد احمد صاحب کے ایک رشتہ دار تازہ تازہ دارالعلوم دیوبند کی ہوا کھا کر آئے تھے، طبیعت باڑھ پر تھی، یہ جہانا گنج کے رہنے والے تھے رسمی تعارف کے بعد انہوں نے علم غیب رسول کی بحث چھیڑ دی آیات واحادیث

سے نفی علم غیب کے دلائل پیش کرنے لگے، میں نے جواب دینا شروع کیا، محمد احمد صاحب نے کہا کہ اس طرح کی بحث سے تلخی بڑھنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا، سوال جواب تحریری ہونا چاہیے، صاحب خانہ کی اس بات سے ہم دونوں نے اتفاق کیا، میں نے کہا کہ میں چند سوالات حفظ الایمان کے تعلق سے مرتب کرتا ہوں، آپ جواب لکھ کر محمد احمد صاحب کے یہاں بھجوادیں، انہوں نے کہا کہ سوال کی ابتدا میری طرف سے ہوئی ہے، اس لیے سوالات میں مرتب کروں گا- میں نے کہا چلئے یوں ہی سہی، پھر انہوں نے پانچ چھ سوالات کی فہرست مرتب کر کے مجھ سے کہا کہ اس کا جواب تحریر کر کے محمد احمد صاحب کو دے دیجئے- یہ مجھ تک پہنچادیں گے- میں نے وہ رقعہ مدنی میاں کو دکھایا، انہوں نے سوالات کے مدلل جوابات تحریر کیے، میں نے محمد احمد صاحب کے ذریعے یہ تحریر جہانا گنج بھجوادی، دس پندرہ دنوں کے بعد جواب آ گیا، میں نے وہ جواب مدنی میاں کی خدمت میں پیش کیا، اب کے جواب الجواب کے ساتھ کچھ سوالات قائم کر کے حریف کو دفاعی پالے میں لاکھڑا کیا گیا پھر ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا، مدنی میاں نے کہا کہ مناظرے میں دفاعی پوزیشن میں نہیں رہنا چاہیے، اب جو انہیں اپنا دفاع کرنے پر مجبور کر دیا گیا تو وہی ہوا جس کی امید تھی-

انہیں دنوں فارسی کی درس گاہ میں ہم بیٹھے ہوئے تھے کسی نے کہا کہ ملاحسن کو کتنی طرح سے پڑھا جاسکتا ہے، ایک نے کہا ملاحسن (مِلا حُسن) دوسرے نے کہا ہمزہ کا شمار اعداد میں نہیں ہوتا، اس کو ملأ حسن بھی پڑھا جاسکتا ہے (ملأ حُسن) مدنی میاں نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کر کے کہا ملاحسن (مَلَّا ح سُنْ)

مدنی میاں کا خط تحریر زمانہ طالب علمی میں بھی بڑا ستھرا تھا، انار دانہ کی طرح ہر لفظ علاحدہ علاحدہ صاف صاف نظر آتا تھا- ایک دن فارسی کی درسگاہ میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے کئی طرح سے اپنا نام لکھا، ان میں سے ایک خط ایسا تھا جس سے چڑیا کی مبہم سی شکل بن گئی تھی یہ "سید محمد مدنی اشرفی" سے بنی تھی، چڑیا کے پر، بازو، سر، آنکھیں، ٹانگیں غور کرنے پر سب کی جھلک محسوس ہوتی تھی، میں نے کہا میرے نام کا بھی ایسا ہی خاکہ بنا دیجئے، انہوں نے بادنی تامل اسی سے ملتا جلتا خاکہ بنادیا، جن لوگوں نے مدنی میاں کے دستخط دیکھے ہوں گے وہ آج بھی ان کے دستخط

میں ''دَھڑ'' دیکھ سکتے ہیں، سر آنکھیں اور ٹانگیں جو پہلے خاکے میں محسوس کی جاسکتی تھیں، یہ سب کچھ بطور تفنن تھا، جو عادی دستخط میں باقی نہیں رہا-

حضور محدث اعظم ہند جب دارالعلوم اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لاتے جو سالانہ امتحانات کے بعد ہوا کرتا تھا تو بالعموم خانوادے کے طلبہ کو بلا کر ان کا حال معلوم کرتے، ایک بار جلسہ کے موقع پر تشریف لائے، امتحان ختم ہو چکا تھا، مدنی میاں سے پوچھا، امتحان کیسا رہا؟ عرض کیا اچھا رہا، ارشاد ہوا امتحان کس نے لیا؟ عرض کیا قاضی شمس الدین صاحب نے، یہ سن کر محدث اعظم ایک دم سنجیدہ ہو گئے، فرمایا میاں قاضی شمس الدین صاحب نے امتحان لیا اور آپ کہتے ہیں اچھا رہا؟ قاضی صاحب اگر اپنی سطح سے امتحان لینے پر آجائیں تو سید محمد کو فیل کردیں- اگرچہ یہ محدث اعظم کا قاضی صاحب کے لیے نثر میں قصیدہ تھا لیکن پھر بھی اس جملے کے ہر بن مو سے قاضی صاحب کی عظمت علم کا اعتراف ٹپکتا ہے-

ایک سال سالانہ جلسہ میں محدث اعظم تشریف لائے فارسی کی درسگاہ میں تشریف فرما تھے، خدمت والا میں مدنی میاں، احمد میاں، سعید احمد، ملیح اشرف اور فہیم اشرف کے ساتھ میں بھی حاضر تھا- حضرت اقدس نے فرمایا ایک پہیلی بوجھو تو جانیں ''وہ کون سا چار حرفی لفظ ہے کہ ایک حرف کم کرنے پر چار باقی رہے؟ اپنے پلے تو پڑا نہیں، مدنی میاں بھی غور وفکر کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکے کہ احمد میاں نے کہا حضور یہ لفظ ''چادر'' ہوسکتا ہے، یہ جواب سن کر محدث اعظم کا چہرہ کھل اٹھا اور ڈھیر سی دعائیں دیں-

یادش بخیر! آج لگ بھگ اڑتالیس برس ہو گئے سوچتا ہوں مدنی میاں نے زمانۂ طالب علمی میں جس توجہ اور انہماک سے تحصیل علم کی اور بزرگوں کی دعائیں ان کے شامل حال رہیں اسی کا ثمرہ ہے کہ آج وہ شیخ الاسلام والمسلمین کی حیثیت سے علمی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں، وہی علم و فضل کا نور جو عہد طفلی سے جبین سعادت میں پنہاں تھا، ظاہر ہو کر پوری دنیا کو اجالا بانٹ رہا ہے-

می تافت ستارۂ بلندی

(ماہنامہ جام نور، ستمبر ۲۰۱۰ء)

علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی

ہست در سینۂ من آنچہ بکس نتواں گفت

۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۳ءکو مولانا خوشتر نورانی نے ایس ایم ایس کے ذریعے یہ افسوس ناک خبر دی کہ: ''امام علم وفن علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی کا آج ۳۰-۳ بجے وصال ہوگیا-'' خواجہ صاحب تو معناً پہلے بھی مرحوم تھے، اب لفظاً بھی مرحوم ہو گئے- اناللہ وانا الیہ راجعون-

امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے علوم و فنون کا ، بالخصوص تکسیر، توقیت، ہیئت، ارثماطیقی، لوگارثم، ہندسہ، ریاضی کا وارث دنیا سے اٹھ گیا، یہ بجائے خود ایک عظیم المیہ ہے- رونا اس بات کا بھی ہے کہ اب ہمارے درمیان ان گتھیوں کو سلجھانے والا کوئی نظر نہیں آتا جن کی گرہ کشائی ہمارے امام علم وفن کے لیے ایک بات تھی- اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور اپنے جوار رحمت میں قرب عطا فرمائے-

مجھے خواجہ علم وفن سے ملاقات کا دوبار شرف حاصل ہوا، پہلی بار جب وہ پورے علمی جاہ و جلال کے ساتھ مسند تدریس پر فائز تھے اور دوسری بار جب وہ ناقدری زمانہ کے ہاتھوں پوری طرح ٹوٹ چکے تھے- غالباً ۱۹۸۵ء کی بات ہے، ہمارے ادارۂ اشرفیہ کے لیے معقولات کے ایک لائق وفائق استاذ کی ضرورت تھی- ہماری نظریں دور ونزدیک سے جائزہ لینے کے بعد خواجہ مظفر حسین رضوی پر مرکوز ہوگئیں، جامعہ اشرفیہ کے ناظم اعلیٰ قاضی شریعت حضرت مولانا محمد شفیع اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور راقم الحروف شر مصباحی الہ آباد گئے، دارالعلوم غریب نواز کے ایک حجرے میں خواجہ صاحب تشریف فرما تھے، ہماری آمد کی خبر ہو چکی تھی، جیسے ہی ہم حجرے کے قریب پہنچے، خواجہ صاحب دروازے تک آئے اور اس تپاک سے ملے، جیسے کوئی مدتوں کا بچھڑا

ساتھی ملتا ہے- ہم بچھڑے ہوئے ساتھی تو نہیں تھے، لیکن گزشتہ ایام میں ہم نے اپنے ایک محسن کا قرض چکایا تھا، جس کے سبب ہم خواجہ صاحب کی نظروں میں تھے-

رسمی گفتگو کے بعد ناظم اعلیٰ صاحب نے کہا کہ اشرفیہ کو آپ کی تدریسی خدمات کی ضرورت ہے، یہاں ہم اسی ارادے سے آئے ہیں- اس وقت خواجہ صاحب کے چہرے پر بشاشت دیدنی تھی، اشرفیہ اُن دنوں بھی ہندوستان کے مدارس میں قدر اول کی چیز تھا، کچھ توقف کے بعد خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اشرفیہ میں تدریس کی خدمات انجام دینا میرے لیے باعث سعادت ہے بشرط آں کہ دارالعلوم غریب نواز کے ارباب حل وعقد بخوشی و رضا مندی مجھے یہاں سے رخصت کرنے کو تیار ہوں- خواجہ صاحب کے چہرے کے بھاؤ سے ہم اسی وقت سمجھ گئے کہ غریب نواز کی مجلس انتظامیہ اس جوہر قابل کو کھونے کے لیے تیار نہیں ہوگی اور ہوا بھی یہی- یوں مبارک پور حضرت خواجہ صاحب کی مہمان نوازی کا شرف حاصل کرنے سے محروم رہا- اس ملاقات کے لمحات میرے لیے یادگار ہیں، وہ یوں کہ خواجہ صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ شررصاحب! میں آپ کو بہت پہلے سے جانتا ہوں، یہ کہہ کر انھوں نے ۱۹۷۱ء کے بحرانی دور کا ذکر چھیڑ دیا، سلسلۂ کلام ختم ہوا تو میں نے اس ملاقات کو غنیمت جان کر ایک سوال کیا جو برسوں سے مجھے خلجان میں مبتلا کیے ہوئے تھا، تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے شعبۂ کلیات کے اساتذہ مجھے مطمئن نہ کر سکے تھے، وہ سوال یہ تھا کہ عناصر اربعہ میں سب سے ثقیل عنصر ''عنصر ارض'' ہے تو مختلف الطبائع مرکبات کا ثقل ''ارض'' سے کم ہونا چاہیے- خواجہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اور کچھ؟ میں نے اسی سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ معجون، اطریفل یا حلویٰ وغیرہ میں شکر ڈالی جاتی ہے تو مرکب کی مٹھاس شکر کی مٹھاس سے زیادہ نہیں ہوگی- خواجہ صاحب نے کہا کہ اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں تھی، آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب عنصر ارض سب سے ثقیل ہے تو وہ مرکبات جن میں دیگر عناصر بھی شامل ہیں، جن میں معدنیات بھی ہیں ان کا ثقل ''ثقل ارض'' سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے- میں نے کہا یہی میرا منشائے سوال ہے- خواجہ صاحب نے فرمایا اس کا جواب ملا محمود جون پوری بہت پہلے

دے چکے ہیں، وہ یہ کہ زمین بہت **متخلخل** ہے، اگر اس کا **تخلخل** دور ہو جائے تو ''ارضیت صرفہ'' کا ثقل ہر مرکب سے زیادہ ہوگا۔

دوسری ملاقات ۲۰۰۹ء میں خانوادۂ عثمانی بدایوں کے چشم و چراغ مولانا اسید الحق قادری کے در دولت پر صاحبزادہ مولانا عطیف قادری کی تقریب ولیمہ میں ہوئی۔ ایک خیر خواہ نے بتایا کہ خواجہ صاحب بھی آئے ہوئے ہیں، میری خوشی کی انتہا نہ رہی، شوق ملاقات دامن گیر ہوا، موصوف الذکر نے میری رہنمائی کی، خواجہ محترم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ صاحب نے اس بندۂ آثم کو جو عزت بخشی وہ میری حیثیت سے فزوں تر تھی۔ پورا کمرہ حضرت والا کے تلامذہ اور معتقدین سے کھچا کھچ تھا۔ خواجہ صاحب مجھ سے یوں مخاطب ہوئے: ''ڈاکٹر صاحب! آپ کی تحریریں جام نور میں پڑھتا رہا ہوں، دل نے بہت چاہا کہ آپ کی تائید میں کچھ لکھوں، یہ نہیں تو آپ ہی کو اپنے تاثرات لکھ بھیجوں لیکن جب جب قلم اٹھایا، حالات کے جبر نے ہاتھ پکڑ لیا۔'' خواجہ صاحب کے تلامذہ یہ سن رہے تھے، اپنے استاذ کا کرب محسوس کر رہے تھے، ان کی نم ناک آنکھیں ان جملوں کے بعد کی خاموشی کی تفسیر بیان کر رہی تھیں۔ پہلی ملاقات والا مرد جری دوسری ملاقات میں ایک مظلوم کی صورت میں نظر آیا، یہ ستم آسمان نے نہیں ڈھائے تھے، نگاہوں کی افسردگی صاف کہہ رہی تھی:......ع

که بامن هر چه کرد آں آشنا کرد

مستقبل میں جب ہیئت کے مسائل سر ابھاریں گے، لوگارثم کی تاریک گلیوں میں چراغ ہدایت کی ضرورت ہوگی، ہندسہ و ریاضی کی گتھیاں سلجھائے نہیں سلجھیں گی، اس وقت ہر ایک کی زبان حسرت ترجمان پر ہوگا۔ واخواجہ مظفر حسیناہ۔

(ماہنامہ جام نور، دسمبر ۲۰۱۳ء)

مفتی اشفاق حسین نعیمی

(مفتی اعظم راجستھان)

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے مخالف طاقتیں جس دور میں جس طرح کے حربے استعمال کرتی رہی ہیں، حق پرست علما اصول شریعت کو اسلحہ بنا کر ان کا قلع قمع کرتے رہے ہیں۔ دور آخر میں دو بڑے فتنوں نے سرا بھارا۔ ایک وہابی تحریک کے نام سے معروف ہوا، دوسرا مرزائی تحریک کے نام سے۔ مولانا اسماعیل دہلوی نے عام مسلمانوں کو مشرک بنانے کے لیے اپنے قلم کی دھار تیز کی اور مرزا غلام احمد قادیانی نے جاگتی آنکھوں سے نبوت کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ مولانا دہلوی خاندان ولی اللّٰہی کے فرد تھے، اپنے زور خطابت سے محفل میں گرمی پیدا کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا، اس لیے ان کا ایک مختصر سا کتابچہ ''تقویۃ الایمان'' دیکھتے دیکھتے پورے ملک میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا اپنا کوئی خاندانی بیک گراؤنڈ نہیں تھا لیکن وہ بلا کے ذہین تھے، انگریزی حکومت کے پاسدار تھے، سرکار انگلیشیہ کی انہیں بھرپور حمایت حاصل تھی۔ اس لیے یہ فتنہ بھی وہابی تحریک سے کم خطرناک نہ تھا۔ دونوں فتنے کاغذ وقرطاس کے ذریعے پھیلتے رہے اور بھولے بھالے مسلمانوں کے ذہن ودماغ کو متأثر کرتے رہے۔ ایسے پرفتن دور میں علمائے ربانیین نے تصنیف وتالیف کا سہارا لیا اور بالآخر دین ومذہب کے ان مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

مفتی اعظم راجستھان حضرت علامہ مفتی محمد اشفاق حسین نعیمی اشرفی مدظلہ العالی ان اساطیر الاولین کے نمائندے ہیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے سب سے اہم ستون یعنی دینی درس گاہ کو اپنا نصب العین بنایا جو تحفظ دین اور ترویج واشاعت اسلام کا بنیادی پتھر ہے۔

تصنیف و تالیف، تقریر و بیان سب اسی کے رہین منت ہیں۔ خدا بھلا کرے مولانا محمد اکبر رضوی کا جن کے طفیل مجھے حضرت مفتی اعظم راجستھان سے نیاز و ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تقریباً ۲۰؍ برس پہلے مولانا موصوف ہمارے طبیہ کالج (دہلی) میں بحیثیت ممتحن تشریف لائے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ رضوی اور مصباحی کے ٹائٹل نے بغیر کسی مزید تعارف کے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ دوسرے سال جب میں زبیریہ طبیہ کالج جودھ پور بحیثیت ممتحن گیا تو موصوف الذکر نے چند طلبہ کو ریلوے اسٹیشن جانے کی ہدایت کی تا کہ مجھے کالج تک پہنچنے میں پریشانی نہ ہو۔ قصہ مختصر کالج کے فرائض سے فراغت کے بعد مولانا رضوی صاحب کے فرستادہ طلبہ کے ساتھ دارالعلوم اسحاقیہ گیا۔ دارالعلوم تک پہنچنے کے لیے پہاڑیوں کی بعض تراشیدہ سڑکوں اور کج مج گلیوں سے گزرتا رہا اور ماضی کے جھروکوں سے مبارک پور کی یادیں دل و دماغ کو معطر کرتی رہیں۔ یادش بخیر! مبارک پور کی گنجان آبادی میں دارالعلوم اشرفیہ ۱۳۵۳ھ سے قائم تھا، حافظ ملت بیرون قصبہ دین و مذہب کا ایک عظیم شہر بسانا چاہتے تھے۔ یہ علاقہ غیر آباد تھا، آئے دن یہاں سے گزرنے والوں کو رہزن لوٹ لیا کرتے تھے۔ خدا کا فضل ہوا، وہ سُبھ گھڑی آ گئی جب اسی غیر آباد علاقے میں کئی ایکڑ زمین خرید کر ''الجامعۃ الاشرفیہ'' کا سنگ بنیاد رکھا گیا، قصبہ میں تعمیری چندہ کا دور شروع ہوا۔ راقم الحروف نے اس دوران ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک مصرع تھا **''صحرا کے کنکر پتھر پر پھول رہی ہے سرسوں''** حافظ ملت اس نظم کو جب سماعت فرماتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور مجھے اپنی نیک دعاؤں سے نوازتے۔ ہاں تو میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جامعہ اشرفیہ کے تعلق سے یہ نظم خالص استعاراتی تھی جسے دارالعلوم اسحاقیہ کی حقیقت آئینہ دکھا رہی تھی۔

مولانا رضوی صاحب کی قیام گاہ پر تھوڑی دیر رکنے کے بعد حضرت مفتی صاحب کی بارگاہ میں حاضری ہوئی، ایک طرف میں حضور مفتی صاحب سے مخاطب ہو کر لطف سماعت اٹھا رہا تھا، دوسری طرف پھر ذہن کے ایک گوشے میں یادوں کے چراغ جل رہے تھے۔ یہ چراغ میرے پیر و مرشد اور استاذ گرامی حضور حافظ ملت کے اوصاف کمال کی تیل بتی سے روشن نظر آ رہے تھے۔ علمی جلالت، وجاہت، متانت، تقویٰ، انکسار، مروت، اصاغر نوازی، کم الفاظ

اور ہلکی آواز میں خیالات کی ترسیل، یہ وہ اوصاف ہیں جو حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ میں دیکھ رہا ہوں اور حافظ ملت یاد آئے جا رہے ہیں۔

میری یہ گنہگار آنکھیں حضور مفتی اعظم، حافظ ملت، شیر بیشۂ اہل سنت، مجاہد ملت، محدث اعظم، سرکار کلاں علیہم الرحمہ جیسے صلحائے امت کی زیارتوں سے بارہا شرف یاب ہو چکی ہیں۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ آج اگر کوئی اپنے تصور کی آنکھوں سے ان خداوندان نعمت کو دیکھنا چاہتا ہو تو وہ حضرت مفتی اعظم راجستھان کی زیارت کرے۔

اعلیٰ حضرت نے دین و مذہب کی اشاعت کے لیے جن دس نکات کا ذکر فرمایا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ ''حمایت مذہب اور رد بدمذہباں میں مفید کتب و رسائل مصنفوں کو نذرانہ دے کر تصنیف کرائے جائیں'' احقر کی نگاہ میں اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب قلم کار اپنی خانگی ضروریات سے بے نیاز ہوگا تو وہ یکسوئی کے ساتھ خدمت دین کرے گا اور ذہن و دماغ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ ورنہ نتیجہ معلوم

شب چو عقد نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

آج تصنیف و تالیف کا جو معیار ہے وہ جگ ظاہر ہے، بیشتر مجلّات کے مضامین کا حال بھی سب کو معلوم ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اعلیٰ حضرت کے اس قول پر سختی سے عمل کیا ہے۔ میرے سامنے (بموجودگی مولانا یٰسین اختر مصباحی) حضرت مفتی صاحب نے اپنے صاحبزادے حاجی محمد معین الدین اشرفی کو یوں ہدایت فرمائی، **''یہ بات گرہ میں باندھ لو! جس سے لکھنے پڑھنے کا کام لو، اس کو حق المحنۃ ضرور دیا کرو۔''** میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ حاجی معین الدین اشرفی نے اس دن سے اس ہدایت پر عمل کرنے کا خود کو پابند کر لیا ہے اور کئی ایسے اہل قلم ہیں جن سے حاجی صاحب کی یہ معاملت تا حال قائم ہے۔

دین و مذہب کی خدمت اور مسلک اہل سنت کی اشاعت کا جو کام دار العلوم اسحاقیہ، جودھ پور کے ذریعہ ہو رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی افراد اہل سنت کی شیرازہ بندی کی جدو جہد میں بھی ناقابل فراموش خدمات ہیں۔ جماعتی یا مشربی

اختلاف اورتنازع کی خبر آپ تک پہنچتی تو آپ سخت دل برداشتہ ہوجاتے اور ’’گربہ کشتن روز اول‘‘ کے مصداق سرچشمہ کونہر و بحر ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے۔حضرت مفتی صاحب کو اشرفی اور رضوی حضرات کے مابین اختلاف کا علم ہوا تو آپ بے چین ہو گئے اور کچھ دنوں تک تو ان دوگروہوں کے درمیان کا تنازع رفع کرنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔۱۹۰۷ء کی بات ہے، مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے مجھے حکم دیا کہ سنبھل کے جلسۂ ختم بخاری میں شرکت کے لئے جارہا ہوں تم بھی تیار رہنا۔ میں نے کہا خیر تو ہے؟ مجاہد دوراں نے فرمایا،حضرت مفتی اشفاق حسین صاحب نے اس موقع پر ایک میٹنگ رکھی ہے جس میں اشرفی رضوی تنازع دور کرنے کی حکمت عملی پر غور کیا جائے گا۔ چنانچہ ایم پی صاحب کے ہمراہ مولانا یٰسین اختر مصباحی اور راقم الحروف سنبھل پہنچے۔ختم بخاری کی تقریب کے بعد مخصوص میٹنگ ہوئی جس میں اتفاق رائے سے چند تجاویز منظور کی گئیں،جن کا ڈرافٹ احقر نے تیار کیا تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے اس میٹنگ کے آغاز میں جن پُر درد الفاظ اور پرسوز لہجے میں اشرفی رضوی اختلافات کے تعلق سے اپنے دکھ کا اظہار کیا تھا، اسے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو شریک بزم تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اشرفی رضوی کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کے وقت بھی حضرت مجاہد دوراں تنہا ایسی شخصیت تھے جو رضوی حلقے میں بھی یکساں مقبول تھے۔ قصہ مختصر ان تجاویز کی روشنی میں حضرت مفتی صاحب نے جودھ پور پہنچ کر فریقین کے نام خطوط لکھے۔ پھر کیا ہوا؟ اس کا کچھ زیادہ علم مجھے نہیں ہے۔ البتہ ایک بار مجھے حکم ہوا کہ اختصار کے ساتھ مصالحتی فارمولے تیار کیے جائیں۔ چنانچہ حسب ذیل مصالحتی فارمولے مکتبۂ فاروقیہ میں صاحبزادہ حاجی محمد معین الدین اشرفی کے پاس نورچشم ڈاکٹر احمد جمال سلمہ کے ذریعہ بھیجے گئے۔

۱۔ ہمارے درمیان (سلسلہ عالیہ اشرفیہ ورضویہ کے افراد کے درمیان) عقائد کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۲۔بعض فقہی مسائل میں اختلاف ممکن ہے اور اس میں کوئی مضائقہ اور شرعی مواخذہ نہیں ہے۔

۳۔بعض فقہی مسائل میں اختلاف کے باوجود ہم ایک دوسرے کو حق پر سمجھتے ہیں۔

۴۔جتنی ہفوات وخرافات اورتوہین وتذلیل کی باتیں میڈیا کے مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ہم ان کی پرزور مذمت کرتے ہیں اوراپنے حلقہ اثر کے افراد کو ہدایت کرتے ہیں کہ سلسلہ اشرفیہ اور سلسلہ رضویہ کے افراد آپس میں شیروشکر کی طرح رہیں اور دونوں سلاسل کے بزرگوں کا احترام اپنے لیے لازم قرار دیں۔

۵۔ دور حاضر میں مذہب حق اہل سنت و جماعت کی سب سے بڑی پہچان اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان ہیں۔

ان عبارات کے نیچے اُن حضرات کے نام درج کیے گئے تھے جن سے تصویب مقصود تھی۔

علماومشائخ سلسلہ عالیہ اشرفیہ:

شیخ طریقت علامہ سید محمد مدنی میاں صاحب، غازی ملت علامہ سید محمد ہاشمی میاں صاحب، فاضل اجل علامہ سید مثنی میاں صاحب، اشرف العلماء سید حامد اشرف صاحب، حضرت علامہ سید اظہار اشرف صاحب، مولانا محمد معین اشرفی صاحب۔

علماومشائخ سلسلہ عالیہ رضویہ:

شیخ طریقت علامہ ازہری میاں صاحب، حضرت علامہ مفتی شریف الحق صاحب، حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری صاحب، حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین صاحب، حضرت مفتی غلام محمد خاں صاحب، حضرت مولانا مجیب اشرف صاحب، حضرت علامہ مفتی مطیع الرحمن صاحب۔

کچھ دنوں کے بعد مکتبۂ فاروقیہ دہلی میں غازی ملت تشریف لائے، ڈاکٹر شفیق الرحمن برق وغیرہ کی موجودگی میں متذکرہ تجاویز اور مصالحتی فارمولے کے تعلق سے گفتگو ہوئی تو غازی ملت نے مکمل اتفاق کرتے ہوئے ایک تحریر بھی عنایت فرمائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ میری اس تحریر کو علماومشائخ کچھوچھا اور افراد سلسلہ عالیہ اشرفیہ کی نمائندہ تحریر تصور کیا جائے۔

یہ سن کر حاضرین کے دل باغ باغ ہو گئے اور ہمیں یقین ہو چلا کہ ان شاء اللہ اب یہ تنازع آپ اپنی موت مر جائے گا۔پھر کچھ دنوں کے بعد حاجی محمد معین الدین اشرفی سے حضرت

مفتی صاحب کی آمد کی خبر ہوئی میں ملاقات کے لئے گیا۔ مفتی صاحب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔ میں نے پیش رفت کے بارے میں معلوم کیا، حضرت نے فرمایا کہ بریلی شریف سے میرے (رجسٹرڈ) مکتوب کے جواب میں اب تک کوئی تحریر نہیں آئی۔ فون پر رابطہ کرنے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ اس تنازع کے تعلق سے، محدث کبیر صاحب، مفتی مطیع الرحمن صاحب، مفتی غلام محمد خاں صاحب اور خواجہ مظفر حسین صاحب جس بات پر اتفاق کرلیں گے اسے میرا فیصلہ سمجھا جائے۔ میں نے مفتی صاحب کے چہرے پر کسی قدر بے اطمینانی کے آثار محسوس کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضور! اگرچہ یہ جواب منفی نہیں مگر معاملہ طویل ضرور ہوگیا۔ کیوں کہ ان سب حضرات سے ملاقات کے لئے وقت تو خرچ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور سب کو یکجا کرنا ہمارے حیطۂ اختیار میں نہیں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ میں مدتوں بے خبر رہا، اتنا ضرور ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی مخلصانہ کوششیں یقینا بارآور ہوئیں اور اب رضوی اشرفی اختلاف کی بھنک دور دور تک سنائی نہیں دے رہی ہے۔

(ماہنامہ کنز الایمان دہلی)

مارچ ۲۰۰۷ء

پروفیسر سید غلام سمنانی

پروفیسر سید غلام سمنانی صاحب جون پور کے رہنے والے تھے۔ شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں کے پیر اور برادرِ کلاں حضرت مولانا سید اشرف حسین کے نواسے تھے۔ ذاکر حسین پوسٹ گریجویٹ کالج (ایوننگ) میں انگلش ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر تھے۔ مشہور مؤرخ ہاشم کی کتاب کا انھوں نے اردو میں ایسا ترجمہ کیا جسے اردو کی اوریجنل کتاب کہیے تو بجا ہے۔ کسی کتاب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ وہ بذات خود اصل کتاب معلوم ہو۔

موصوف سے میری ملاقات ۱۹۸۰ء میں ہوئی۔ مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی جب ۱۹۸۰ء میں لوک سبھا کے الیکشن میں کام یاب ہوئے تو انھیں DIZ ایریا میں عارضی طور پر فلیٹ الاٹ ہوا۔ اسی فلیٹ کے برابر میں جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب کو بھی جگہ ملی تھی۔ DIZ ایریا میں تقریباً روزانہ میں جایا کرتا تھا۔ مولانا ارشد القادری بھی کئی ہفتے ان کے یہاں مقیم رہے۔ اسی دوران مولانا کی رہائش گاہ پر جناب سمنانی صاحب سے ملاقات ہوئی اور مزاجی ہم آہنگی کی وجہ سے ہم دونوں بہت جلد شیر وشکر ہو گئے۔

سمنانی صاحب اینگلو عربک کالج کے ٹیچرس ہوسٹل میں ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے اور ہر سہ جانب الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک دن انھوں نے بتایا کہ اس کمرہ میں پہلے خواجہ نثار فاروقی رہتے تھے۔ یہ ساری کتابیں انھیں کی امانت ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اودھ پنچ، زمیندار، نگار وغیرہ کی فائلیں بھی تھیں۔

سمنانی صاحب انگریزی کے علاوہ اردو اور فارسی ادبیات پر زبردست ملکہ رکھتے تھے۔ خواجہ محمد یونس جوان کے روم کے بعد والے تیسرے روم میں رہتے تھے، وہ اپنے کمرے سے آتے جاتے اکثر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ دیوان صائب تبریزی پر تحقیقی کام کیا تھا۔ ایران کا سفر بھی کر چکے تھے، مگر سمنانی صاحب کو ہمیشہ خود پر فائق سمجھتے تھے اور یہ انکسار کے سبب نہیں تھا بلکہ حقیقت میں سمنانی صاحب فارسی اور اردو زبانوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انگریزی

لٹریچر کے تو وہ استاذ تھے ہی۔

ذاکر حسین کالج کے اساتذہ انھیں علامہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ایوننگ کالج میں علامہ کا مطلب تھا پروفیسر سمنانی۔

سمنانی صاحب اینگلو عربک اسکول کے جس روم میں رہتے تھے، اس کے برآمدے میں ایک کرسی ہمیشہ رہا کرتی تھی، جو اس بات کا اعلان تھا کہ سمنانی صاحب دہلی میں تشریف فرما ہیں۔

جن دنوں میں حدائق بخشش کی تصحیح کر رہا تھا۔ میں نے ان کے مشورے سے بہت فائدہ اٹھایا۔

سمنانی صاحب کے بڑے بھائی مولانا سید فصیح اشرف جو صدرالا فاضل کے شاگرد تھے، جب اپنے داماد سید فضل الرحمٰن کے یہاں آتے تو مجھے فون پر اپنی آمد کی خبر کرتے اور یہ کہ سمنانی کو بھی ساتھ لانا۔سمنانی صاحب کے یہاں فون نہیں تھا۔نہ انھیں اس کی ضرورت تھی۔ یہ بالکل بے نیاز قسم کے آدمی تھے۔

ایک دن جب وہ گھر سے آئے اور میں ان سے ملنے گیا تو ان کی میز پر لطائف اشرفی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کتاب کی برسوں سے تلاش تھی۔آج آپ کے یہاں اس کا نیاز حاصل ہو گیا۔فرمایا جتنی دیر پڑھنا ہے، پڑھو۔ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا مزاح تھا۔اسی طرح جب ہاشم صاحب کی کتاب کا ترجمہ مجھے عطا کیا تو اس پر بھی لکھا ''عزیزی شرر مصباحی کی خدمت میں بجبر واکراہ''۔ یہ بھی مزاحیہ جملہ تھا۔

لطائف اشرفی میں مرگی دور کرنے کا ایک تعویذ تھا۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کے خاندان کی کتاب ہے۔آپ مجھے اس کی اجازت عطا فرمائیں تو انھوں نے کہا کہ مگر مجھے اس کی کسی نے اجازت نہیں عطا کی ہے۔

کچھ دنوں بعد جب مولانا بھائی آئے اور مجھے خبر دی کہ میں آ گیا ہوں۔سمنانی کو بھی ساتھ میں لانا تو اینگلو عربک اسکول سمنانی صاحب کے روم پر گیا اور ان سے کہا کہ لطائف اشرفی بھی ساتھ میں لے لیجیے۔مولانا بھائی سے مرگی کے تعویذ کی اجازت لینی ہے۔

الغرض ہم ڈابری موڑ دہلی پہنچے۔مولانا بھائی اور ان کے داماد سے ملاقات ہوئی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی۔مولانا بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی بیٹی کے یہاں آیا ہوں

۔ پیدائش کے دن قریب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب (داماد) اپنی ڈیوٹی پر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اسپتال چلے جاتے ہیں۔ بیٹی اکیلی رہتی ہے۔ اگر کوئی مسماۃ آپ کی نظر میں ہوں تو کچھ دنوں کے لئے یہاں آجائیں۔ میں نے کہا کہ میری نظر میں ایسی کوئی عورت نہیں ہے۔ مگر ان کا اشارہ تھا کہ چند روز کے لئے میری اہلیہ آجائیں۔ میں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ گھر کا سارا ذمہ انھیں کے سر ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ اچھا کوئی انتظام کرلیا جائے گا۔

رخصت ہوتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ لطائف اشرفی ہے۔ اس میں مرگی کا ایک تعویذ ہے جس کے بارے میں حضرت مخدوم اشرف سمنانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں ''ہرگز باز نہ گردد''، اس تعویذ کی اجازت مطلوب ہے۔ انھوں نے اجازت مرحمت فرمائی۔

کچھ مہینوں کے بعد جب مولانا بھائی دوبارہ آئے اور مجھے خبر ہوئی تو میں نے دہلی کے معروف عالم دین مفتی ثمر میاں کے خدمت گزار حافظ مقصود علی کو بلایا جن کی اہلیہ کو مرگی کا دورہ آتا تھا۔ میں نے مقصود علی سے کہا کہ آپ خوش نصیب ہیں۔ مولانا بھائی آئے ہیں۔ آپ آج یا کل میں ایک مرغا خریدیئے مگر شرط یہ ہے کہ اس کے سارے پر سفید ہوں اور لے کر ڈابری موڑ مولانا بھائی کے یہاں چلے جایئے، انھیں رہائش گاہ کا پتا بتا دیا۔ مقصود بھائی بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز مرغا لے کر میرے خط کے ساتھ گئے۔ دو تین گھنٹے کے بعد میرے پاس آئے اور کہا کہ حضرت نے آپ کو سلام کہا ہے۔ مجھے تعویذ عنایت کیا ہے اور مذبوحہ مرغا آپ کے لئے بھجوایا ہے۔ مولانا بھائی نے یہ تعویذ مرغ کے خون سے یا جگر سے جو دم بستہ ہوتا ہے، جیسے بھی لکھا، اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لطائف اشرفی میں بھی اس کی تفصیل نہیں ہے۔ مقصود علی کی اہلیہ کو بہت فائدہ ہوا اور مرگی کا دورہ دوبارہ نہیں پڑا۔

جب یہ واقعہ میں نے سمنانی صاحب کو بتایا تو انھوں نے اپنے ساتھی پروفیسر صلاح الدین صاحب کو آواز دی جو قریب میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ سمنانی صاحب نے کہا کہ مصباحی صاحب کو ایک تعویذ کی اجازت مل گئی ہے۔ آپ کے لڑکے کو مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ آپ ایک سفید مرغ کا انتظام کیجیے جس کا ایک پر بھی کالا نہ ہو۔ صلاح الدین صاحب نے چند روز کے بعد انتظام کیا۔ میں ان کے گھر گیا اور بادل ناخواستہ مرغ ذبح کر کے اس کے دم بستہ (جگر) سے تعویذ لکھا اور صاحبزادے کے گلے میں پہنا دیا۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ صاحبزادے کا دورہ کم ہوا، ختم ہوا یا کیا ہوا لیکن یہ ضرور ہوا کہ میں ہفتہ عشرہ تک ایسا بیمار ہوا کہ

اللہ کی پناہ۔ کیوں کہ سمنانی صاحب گرمی کی چھٹیوں میں گھر چلے گئے تھے۔ میں بھی اپنے گھر آ گیا تھا، پھر نہ میں نے صلاح الدین صاحب کے لڑکے کی بیماری کے بارے میں کچھ پوچھا نہ انھوں نے اس کا ذکر کیا۔

سمنانی صاحب نے حضرت امیر خسرو پر تحقیقی کام کیا ہے۔ کتاب حضرت امیر خسرو کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ایک دن برسبیل تذکرہ انھوں نے کہا کہ یہ جو'' شاہ است حسین بادشاہ است حسین'' والے دوشعر حضرت سلطان الہند سے منسوب کیے جاتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس سلسلے میں بہت چھان بین کی لیکن کہیں بھی پرانی کتابوں، مخطوطوں یا سلطان الہند کی غزلیات میں ان دوشعروں کا ذکر نہیں پایا۔

ابھی حال میں سمنانی صاحب کے انتقال کے بعد درگاہ شاہ عبد السلام کناٹ پلیس کے ایک خاص فرد جناب وکیل احمد فخری کے یہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دیوان دیکھا جو انتہائی خوش نما اور دیدہ زیب ہے، اس میں یہ دوشعر موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چند برس پہلے جب میں بارگاہ سلطان الہند میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ یہ دوشعر آستانہ کی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں۔

سمنانی صاحب جب اپنے وطن محلہ میر مست جون پور سے واپس آئے تو اپنے ساتھ صحائف اشرفی بھی لائے۔ مجھے آنے کی اطلاع ہوئی تو میں در دولت پر حاضر ہوا۔ رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے کہا کہ یہ نانا جان (شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کا مجموعۂ کلام ہے۔ ایک ایک غزل پڑھنے کے قابل ہے۔ رنگ تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دیوان کی ورق گردانی میں ایک شعر پر میری نظر ٹھہر گئی۔ میں نے سمنانی صاحب کو متوجہ کیا تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ نانا جان نے ایسے کیسے لکھ دیا۔ پھر انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس کی طباعت وغیرہ کا سارا کام سید امین اشرف کچھوچھوی نے کیا ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں استاد ہیں، انھیں سے رجوع کیا جائے۔ سمنانی صاحب جیسے علم داں نے جب امین اشرف سے مسئلہ ما نحن فیہ میں رجوع کرنے کی بات کہی تو میرے دل میں امین میاں کی علمی فضیلت راسخ ہو گئی۔ میں نے امین میاں صاحب کے نام اپنی طرف سے خط لکھا اور لفافہ پر سمنانی صاحب نے ایڈریس لکھا، ڈاک کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی ہفتے کے انتظار کے بعد امین میاں صاحب کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ میرا خط اپنے خط سے جوڑ کر انھوں نے حضرت سرکار کلاں کی خدمت میں کچھوچھا

بھیج دیا تھا اور سرکارکلاں نے میرے معروضے کا جواب دینے پر سید حسن مثنیٰ انور صاحب (ابن محدث اعظم ہند) کو مامور کردیا ہے۔

امین میاں صاحب کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو خط مثنیٰ میاں نے امین میاں کو لکھا تھا، اس میں معروضہ کا جواب بھی شامل تھا۔ مگر اس سے زیادہ آپ کے (میرے) بارے میں تحریر تھا جس کا ذکر اس خط میں مناسب نہیں ہے۔ (یہ امین میاں نے لکھا تھا) یوں میرے معروضے کو مثنیٰ میاں نے علمی مسئلہ کے بجائے سیاست زدہ کردیا تھا اور الزام یہ تھا کہ شررمصباحی مفتی شریف الحق امجدی کا شاگرد ہے۔ اس سے پہلے یہ سوال کسی نے مفتی شریف الحق سے کیا تھا، شررمصباحی نے اس کو زندہ کردیا ہے۔

حسن مثنیٰ میاں کی یہ ساری باتیں غلط تھیں۔ اس لئے جب میں نے سمنانی صاحب سے کہا کہ ہمارے درمیان کی مخلصانہ گفتگو کو مثنیٰ میاں نے سیاسی جامہ پہنا دیا ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ ان کے ذہن میں ۱۹۷۱ء والا اشرفیہ کا بحران رہا ہوگا۔ اس لیے آپ کے خط کو انھوں نے دوسری نظر سے پڑھا۔

کچھ دنوں کے بعد مبارک پور کی حاضری میں میں نے درگاہ کچھوچھا شریف کی حاضری کا ارداہ کیا۔ گھر کی گاڑی تھی، اس لئے آستانۂ مخدوم سمنانی اور دیگر آسودگان راحت کے مزارات پر حاضری دے کر کچھوچھا شریف گیا۔

کچھوچھا شریف میں سب سے پہلے سید ملیح اشرف میاں کے گھر گیا۔ جناب خود بدولت باہر آئے اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کون؟ میں نے کہا کہ مبارک پور سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ بس اتنا کہنا تھا کہ انھوں نے مجھے گلے سے لگالیا اور کہا کہ میں نے آواز سے پہچان لیا کہ آپ شررمصباحی ہیں وہاں سے سرکارکلاں کے مکان پر اُن کے صاحبزادے اور اپنے ہم سبق جناب سید احمد میاں سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ دس پندرہ منٹ ہم باتوں میں مصروف تھے کہ سمنانی صاحب کا ذکر آ گیا۔ سید احمد میاں نے کہا کہ ابھی دس منٹ پہلے وہ ہمارے یہاں سے گئے ہیں۔ شاید مظفر میاں کے یہاں موجود ہوں۔ یہ سنا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سید احمد میاں سے رخصت لے کر قبلہ مظفر میاں کے مکان پر گیا۔ دروازہ پر دستک دی۔ معلوم ہوا کہ سمنانی صاحب موجود ہیں۔

سمنانی صاحب سے ملاقات کے دوران میں نے کہا کہ دہلی میں ہمارے درمیان جو

حضوراشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شعر کے تعلق سے گفتگو ہوئی تھی، جس کے بعد کی تفصیل سے آپ واقف ہیں۔اب حسن مثنیٰ صاحب نے اسے سیاسی مسئلہ بنادیا ہے۔ یوں میں نے انھیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔سمنانی صاحب سے میں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ اس سلسلے میں جو ہمارے درمیان ابتدائی بات ہوئی تھی، جس کے بعد طے پایا تھا کہ اس کا جواب سیدامین اشرف صاحب سے حاصل کیا جائے، جس کا منفی اثر مرتب ہوااس لئے آپ چندالفاظ تحریر کردیں تاکہ میرے سر سے یہ الزام اُٹھ جائے جوحسن مثنیٰ میاں نے عائد کیا ہے۔سمنانی صاحب نے وہیں مظفر میاں کے در دولت پرایک طویل تحریر لکھی جس میں حقیقت واقعہ کی ابتدا سے انتہا تک تفصیل تھی۔

مجھ سے کہا کہ جو کچھ اور جتنا کچھ سچ تھا، میں نے سب کچھ تحریر کردیا۔ یہ خط میں نے ماہنامہ اشرفیہ میں چھپوادیا مگر افسوس کہ میری درگاہ شریف میں حاضری اور کچھوچھا مقدسہ میں احباب کی ملاقات سب کو خارج کرتے ہوئے مثنیٰ میاں نے لکھا کہ شرر مصباحی کچھوچھا ایک منصوبہ کے تحت آیا تھا، اسے معلوم تھا کہ سمنانی صاحب فلاں تاریخ کو یہاں آنے والے ہیں۔ سمنانی صاحب سے شرر مصباحی نے کچھوچھا آکر ایک منضبط تحریر پر دستخط لے لیے۔سمنانی صاحب چشم مروت کے مارے ہوئے نے بے سوچے سمجھے دستخط کردیے۔

میں نے جب حسن مثنیٰ میاں کی ایک تحریر جواشرفیہ میں میری مطبوعہ تحریر کے جواب میں ''وضاحت'' کے عنوان سے اشاعت کے لئے بھیجی تھی۔سمنانی صاحب کواس کا خلاصہ سنایا تو انھوں نے کہا کہ خاموشی کے سوااب اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

ایک دن سمنانی صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ جون پور میں اتر پردیش کی انجمنوں کا نعت خوانی کا مقابلہ ہونے والا ہے۔ میں نے آپ کا نام تجویز کیا ہے۔آپ دودن کالج سے رخصت لے لیجیے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ جون پور حاضر ہوا۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہم نے نعتیہ مقابلہ کے لیے کچھ ضوابط بنائے۔میرے ساتھ کچھوچھا کے ایک اور سید صاحب حکم بنائے گئے جوفیض آباد اودھ یونیورسٹی میں لکچرر تھے۔عشابعد پروگرام شروع ہوا اچھے اچھے کلام مترنم آواز میں سننے میں آئے۔ہم دونوں الگ الگ بیٹھے انجمنوں کے نعت خوانوں کونمبر دیتے رہے۔ایک شرط اور تھی، وہ یہ کہ شعر جیسا بھی ہو، دوبار سے زیادہ نہیں پڑھا جاسکتا۔

اب سنیے!

بنارس کی انجمن کے نعت خوانوں نے پڑھنا شروع کیا۔اس قدر اچھا پڑھا کہ مجمع جھوم اٹھا اور مکرر مکرر کی صدائیں آنے لگیں۔ یہ انجمن والے خوش ہوکر ایک ایک شعر بار بار پڑھنے لگے۔اسٹیج سے انھیں بار بار متوجہ کیا گیا کہ وہ شرائط کا لحاظ رکھیں لیکن انھیں عوام کی تائید حاصل تھی ہماری ایک نہیں سنی گئی۔نتیجہ کار میں نے اسی وقت اعلان کر دیا کہ چوں کہ اس انجمن نے شرائط کا لحاظ نہیں کیا اور بار بار کی یاددہانی پر بھی حکَم کی بات نہیں مانی، اس لئے اس انجمن کو مقابلہ سے باہر کیا جاتا ہے۔

سمنانی صاحب سے ایک دن میں نے اس شعر کا مفہوم معلوم کیا۔

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

انھوں نے کہا کہ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میں خدا سے یہ چاہتا ہوں کہ حبیب کو دیکھوں اور رقیب کو نہ دیکھوں۔ میں نے کہا کہ بظاہر تو شاعر کا یہی مقصود معلوم ہوتا ہے لیکن نمی خواہم از خدا ندیدن رقیب را سے یہ مفہوم مستفاد نہیں ہوتا۔اسی دوران پروفیسر خواجہ محمد یونس اپنے روم سے آگئے۔اور ہماری گزارش پر بیٹھ گئے ورنہ وہ اس طرح کی علمی ابحاث سے دور ہی رہتے تھے۔ان کو بھی شعر سنایا گیا۔انھوں نے بھی وہی مفہوم بتایا جو سمنانی صاحب بتا چکے تھے، پھر توجہ دلائی گئی کہ نمی خواہم از خدا اور ندیدن رقیب را سے یہ مفہوم مستفاد نہیں ہوتا تو وہ بھی ساکت ہوگئے۔اس وقت ہم تینوں اس شعر کے تعلق سے کوئی واضح مفہوم متعین نہ کر سکے۔

نوٹ: اس پہلے صفحہ کی آخری سطر میں ہے
منسلکہ مضمون ... شامل کیا جائے

۷۸۶

وہبہ محترم صاحب الفضل والکرم جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ

مجھ کو ناصحا در معلوم ہوا آپ کے رسالہ فیضان اہلسنت کے اجرا سے بہت خوشی ہے مولائے کریم رسالہ کو مقبولیت کے ساتھ دوام و ثبات عطا فرمائے
پہلا شمارہ الجامعۃ الاشرفیہ نمبر ہے یہ آپکی انتہائی مخلصانہ دانشمندی ہے رسالہ سے مناسبت و مطابقت بھی ہے کیونکہ الجامعۃ الاشرفیہ
فیضان اہلسنت ہی ہے۔

مجھے آپنے حکم دیا ہے کہ الجامعۃ الاشرفیہ کے عنوان پر مضمون حاضر کروں چند سطور پیش خدمت ہیں —

مختصر تاریخ جامعہ اشرفیہ

الجامعۃ الاشرفیہ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کی معراج ترقی کا نام ہے یہ مدرسہ زمانہ قدیم سے ابتدائی منزل میں تھا ختم ماہ شوال
۱۳۵۲ھ میں حضرت صدر الشریعہ قبلہ علیہ الرحمہ نے مجھے اسکی خدمت پر مامور فرمایا میں حاضر ہوا اس وقت اس میں اردو
فارسی حفظ القرآن کی تعلیم تھی دو طالب علم میزان پڑھنے والے درجہ جبرا تھے ایک حاضر دوسرا غیر حاضر۔ بفضلہ تعالیٰ ماہ ذوالقعدہ سے
طلبہ کی آمد شروع ہو گئی یہاں تک کہ فوقانی درجات کے قابل طلبہ کافی تعداد میں جمع ہو گئے منقول شرح سلم بحر العلوم حمد اللہ ترمذی
شریف ہدایہ وغیرہ کا درس جاری ہو گیا دوسرے ہی سال ۱۳۵۳ھ میں درس نظامی کی مکمل تعلیم جاری ہو گئی اور پہلی ماہ شعبان کو
سالانہ جلسہ میں فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی ہوئی کام اتنا بڑھ گیا کہ مدرسہ کی عمارت تنگ ہو گئی اس تیز رفتار تعلیمی ترقی سے
قصبہ پر بہت گہرا اثر پڑا مسلمان اسکی طرف متوجہ ہوئے جدید عمارت کا چندہ شروع ہوا اسی مسلمان بہت غربت و فلاکت کے عالم میں تھے
لیکن پیکر اخلاص و ایثار تھے انھوں نے تن من دھن کی بازی لگا دی وہ بے مثل قربانیاں پیش کیں جو اپنی مثال ہیں عورتوں نے
اپنا پورا زیور اتار کر دیدیا روپیہ پیسہ مکان دکان زمین جو پاس تھا تعمیری چندہ میں دیدیا ۱۳۵۳ھ میں جدید عمارت کی
تعمیر شروع ہوئی جسکی زریں تاریخ باغ فردوس ہے (۱۳۵۳)۔ بہت جلد شاندار دو منزلہ عمارت تیار ہو گئی کام برابر بڑھتا رہا بیرونی
طلبہ کے کھانے کا انتظام مسلمانوں کے مکان پر تھا لیکن جب طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی اور مدرسہ کے بجٹ میں گنجائش ہو گئی تو
مطبخ جاری کر دیا گیا جاگیریں باقی رہیں بیرونی طلبہ کی تعداد بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ مطبخ اور جاگیریں ملا کر تین سو پچاس طلبہ کے
خورد و نوش کا انتظام چلتا رہا اور کام بڑھتا رہا حتی کہ یہ جدید عمارت بھی باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہو گئی اس وقت دار العلوم
اشرفیہ کی کمیٹی نے قصبہ کے باہر وسیع پیمانہ پر عمارت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا زمینوں کی خریداری شروع ہوئی بفضلہ تعالیٰ قصبہ کے
قریب ہی تیس ایکڑ زمین حاصل ہو چکی اور ابھی خریداری جاری ہے —
۵ — ۶ — ۷ مئی ۱۹۷۲ء کو تعلیمی کانفرنس ہوئی یہ کانفرنس ہر اعتبار سے انتہائی کامیاب ہوئی مسلمانان ہند کے پچاس ہزار با ... کا

۴ پورے ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کی عظیم الشان نمائندگی ہو رہی
علماء کرام و مشائخ عظام سیکڑوں کی تعداد میں اجتماع تھا اسٹیج پر تشریف رکھنے
والوں کا پورا مجمع معلوم ہوتا تھا روسا و حکام کرسیوں پر تشریف
فرما تھے مجمع بے پناہ ہر سہ اجلاس نہایت کامیاب رہے اخیر اجلاس
پوری رات رہا اذان فجر پر ختم ہوا حضرت سید العلماء مولانا شاہ سید آل مصطفیٰ
علیہ الرحمۃ والرضوان کی تقریر صدارت روح کانفرنس ثابت ہوئی حضور مفتی اعظم نے
اپنے پورے جذبات کا اظہار فرمایا بھرپور تعاون کا وعدہ فرمایا قوم و ملت کو
بڑا ہی شاندار باوقار خطاب فرمایا الجامعۃ الاشرفیہ کی ضرورت و
اہمیت ظاہر فرماتے ہوئے پورے جوش و خروش سے اسکی امداد و اعانت کی طرف
متوجہ فرمایا اخیر میں حضرت سید العلماء مرحوم سلام کر رہے تھے اور یہ وقت
اذان فجر ہوئی نمایاں و ممتاز کامیابی سے کانفرنس ختم ہوئی بخشنے کا پورے
مقصد پر نہایت خوشگوار اثر پڑا فللہ الحمد والمنہ

والدمحترم کے نام حافظ ملّت کے خط تحریر کا یہ عکس ماہنامہ اشرفیہ سیدین نمبر سے لیا گیا ہے۔

۷۸۶

مکرم و محترم جناب الفضل والکرم جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب زید مجدکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ

مجھ نا مہ صادر ہوا آپکے رسالہ فیضانِ اہلسنت کے اجراء سے بہت خوشی ہے مولائے کریم اسکو مقبولیت کے ساتھ دوام و ثبات عطا فرمائے آمین

پہلا شمارہ الجامعۃ الاشرفیہ نمبر ہے یہ آپکی انتہائی مخلصانہ دانشمندی ہے رسالہ سے مناسبت و مطابقت بھی ہے کیونکہ الجامعۃ الاشرفیہ فیضانِ اہلسنت ہی ہے۔

مجھے آپنے حکم دیا ہے کہ الجامعۃ الاشرفیہ کے عنوان پر مضمون حاضر کروں چند سطور پیش خدمت ہیں۔

الجامعۃ الاشرفیہ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کی معراجِ ترقی کا نام ہے یہ مدرسہ زمانۂ قدیم سے ابتدائی منزل میں تھا ختم ماہ شوال ۱۳۵۲ھ میں حضرت صدر الشریعہ قبلہ علیہ الرحمہ نے مجھے اسکی خدمت پر مامور فرمایا میں حاضر ہوا اس وقت اس میں اردو فارسی حفظ القرآن کی تعلیم تھی دو طالب علم میزان پڑھنے والے درج رجسٹر تھے ایک حاضر دوسرا غیر حاضر۔ بفضلہ تعالیٰ ماہ ذوالقعدہ ہی سے طلبہ کی آمد شروع ہوگئی یہاں تک کہ فوقانی درجات کے قابل طلبہ کافی تعداد میں جمع ہوگئے منقول شرح سلم بحر العلوم حمد اللہ قاضی مبارک شرح تہذیب ہدایہ و غیرہ کا درس جاری ہوگیا دوسرے ہی سال ۱۳۵۳ھ میں درس نظامی کی مکمل تعلیم جاری ہوگئی اور پہلی سال ماہ شعبان کے سالانہ اجلاس میں فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی ہوئی کام اتنا بڑھ گیا کہ مدرسہ کی عمارت تنگ ہوگئی اس تیز رفتار تعلیمی ترقی سے قصبہ پر بہت گہرا اثر پڑا مسلمان اسکی طرف متوجہ ہوئے جدید عمارت کا چندہ شروع ہوا اسنی مسلمان بہت عسرت و فلاکت کے عالم میں تھے لیکن پیکر اخلاص و ایثار تھے انھوں نے تن من دھن کی بازی لگا دی وہ بے مثل قربانیاں پیش کیں جو اپنی مثال آپ ہیں عورتوں نے اپنا پورا زیور اتار کر دیدیا روپیہ پیسہ مکان دکان زمین جو پاس تھا تعمیری چندہ میں دیدیا ۱۳۵۳ھ میں جدید عمارت کی تعمیر شروع ہوئی جسکی زریں تاریخ باغِ فردوس ۱۳۵۳ ہے۔ بہت جلد شاندار دو منزلہ عمارت طیار ہوگئی کام برابر بڑھتا رہا بیرونی طلبہ کے کھانے کا انتظام مسلمانوں کے مکان پر تھا لیکن جب طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور مدرسہ کے بجٹ میں گنجائش ہوگئی تو مطبخ جاری کر دیا گیا جاگیریں باقی رہیں بیرونی طلبہ کی تعداد بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ مطبخ اور جاگیریں ملاکر تین سو پچاس طلبہ کے خورد و نوش کا انتظام چلتا رہا اور کام بڑھتا رہا حتیٰ کہ یہ جدید عمارت بھی باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہوگئی اسوقت دار العلوم اشرفیہ کی کمیٹی نے قصبہ کے باہر وسیع پیمانہ پر عمارت تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا زمینوں کی خریداری شروع ہوئی بفضلہ تعالیٰ قصبہ کے قریب ہی تیس ایکڑ زمین حاصل ہو چکی اور ابھی خریداری جاری ہے۔

۵ – ۶ – ۷ مئی ۱۹۷۲ء کو تعلیمی کانفرنس ہوئی یہ کانفرنس ہر اعتبار سے انتہائی کامیاب ہوئی مسلمانانِ مبارکپور نے ہزاروں مہمانوں کی

۴ پورے ہندوستان کے ہر طبقے کے مسلمانوں کی عظیم الشان نمائندگی ہوئی
علماء کرام و مشائخ عظام سیکڑوں کی تعداد میں اجتماع تھا اسٹیج پر تشریف رکھنے
والوں کا پورا مجمع معلوم ہوتا تھا رؤسا و حکام کرسیوں پر تشریف
فرماتے مجمع بے پناہ ہر سہ اجلاس نہایت کامیاب رہے اخیر اجلاس
پوری رات رہا اذان فجر پر ختم ہوا حضرت سید العلماء مولانا شاہ سید آل مصطفیٰ
علیہ الرحمۃ والرضوان کی تقریر صدارت روح کانفرنس ثابت ہوئی حضور [illegible]
اپنے پورے جذبات کا اظہار فرمایا بھرپور تعاون کا وعدہ فرمایا قوم و ملت کو
بڑا ہی شاندار باوقار خطاب فرمایا الجامعۃ الاشرفیہ کی ضرورت و
اہمیت ظاہر فرماتے ہوئے پورے جوش و خروش سے اس کی امداد و اعانت کی طرف
متوجہ فرمایا اخیر میں حضرت سید العلماء [illegible] سلام پڑھ رہے تھے اور یہ وقت
اذان فجر ہوئی نمایاں و ممتاز کامیابی سے کانفرنس ختم ہوئی بفضلہ تعالیٰ پورے
علاقہ پر نہایت خوشگوار اثر پڑا فللہ الحمد والمنہ

سوانحی خاکہ

نام: فضل الرحمٰن (ایف آر شررؔ مصباحی)

تاریخ ولادت: 15 جون 1944ء

مسقط الرأس: محلہ کٹرہ، پوسٹ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش

تعلیمی لیاقت:

☆ فاضل دینیات، دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پو، اعظم گڑھ

☆ مولوی، عربی و فارسی امتحانات بورڈ، الہ آباد، اتر پردیش

☆ عالم، عربی و فارسی امتحانات بورڈ، الہ آباد، اتر پردیش

☆ فاضل ادب (عربی) لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش

☆ ایف ایم بی ایس، بورڈ آف انڈین میڈیسن اتر پردیش، لکھنؤ

تدریس:

☆ معین المدرسین، دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پور، اعظم گڑھ (دورانِ تعلیم تین سال تک)
☆ ڈیمانسٹریٹر، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، اتر پردیش (1972 سے 1979 تک)
☆ لکچرر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی (1979 سے 2004 تک)

اضافی عہدے/ ذمہ داریاں

☆ ریزیڈینٹ میڈیکل آفیسر، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، اتر پردیش
☆ اسسٹنٹ پروکٹر، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، اتر پردیش
☆ فزیشین، تکمیل الطب کالج اسپتال برانچ قیصر باغ لکھنؤ، اتر پردیش
☆ چیف ایڈیٹر، تکمیل الطب کالج میگزین، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، اتر پردیش
☆ گیمس سپرنٹنڈنٹ، تکمیل الطب کالج لکھنؤ، اتر پردیش
☆ سکریٹری، آل انڈیا ہندی اردو سنگم، اتر پردیش اسٹیٹ
☆ ایڈیٹر، ہمارا سنگھرش (اردو)، آل انڈیا سنڈیکیٹ کانگریس، اتر پردیش
☆ صدر شعبۂ معالجات، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ سرپرست، طبیہ کالج میگزین، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ لائبریری انچارج، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
☆ رکن کورسز کمیٹی، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

- ☆ رکن ایتھیکل کمیٹی، اے اینڈ یو طبیہ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
- ☆ سابق جنرل سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی
- ☆ سابق نائب صدر، آل انڈیا مومن کانفرنس، دہلی اسٹیٹ
- ☆ سابق سرپرست، آل انڈیا یونانی جوائنٹ ایکشن کمیٹی
- ☆ رکن، لٹریری ریسرچ سب کمیٹی، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، وزارت آیوش، حکومت ہند
- ☆ کنسلٹنٹ، یونانی میڈیکل سنٹر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اسپتال، نئی دہلی
- ☆ کنسلٹنٹ، یونانی اسپیشلیٹی سنٹر، دین دیال اپادھیائے اسپتال، نئی دہلی
- ☆ رکن مجلس شوریٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، اتر پردیش
- ☆ Chair Person, Selection CommiteeTKDL Ministry of Science andTechnology Govt. of India
- ☆ Eminent TKDL Unit, CSIR, Ministry of Science and Techonolgy, Govt. of India

اساتذہ:

☆ حافظ ملّت حضرت مولانا حافظ عبد العزیز مرادآبادی
☆ حضرت مولانا حافظ عبد الرؤف بلیاوی
☆ حضرت علامہ مظفر حسن ظفر ادیبی مبارک پوری
☆ حضرت مولانا مفتی عبد المنان اعظمی مبارک پوری
☆ حضرت مولانا قاضی محمد شفیع اعظمی مبارک پوری
☆ حضرت مولانا قاری محمد یحیٰ مبارک پوری
☆ حضرت مولانا سید حامد اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی
☆ حضرت مولانا سید شمس الحق گجہڑوی
☆ پروفیسر صمدی، صدر شعبۂ دراسات شرقیہ، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم شکیل احمد شمسی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم محمد مسیح الزماں ندوی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم سید محمد فاروق رضوی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم خواجہ ساجد حسن کشمیری، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم محمد احمد صدیقی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم فیاض علی صدیقی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ حکیم عبد الجلیل، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ ڈاکٹر تربینی بہادر، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ ڈاکٹر محمد اکمل شمسی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش
☆ ڈاکٹر محمد شعیب، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ، اتر پردیش

نامور تلامذہ:

☆ حکیم وسیم احمد اعظمی، سابق ڈپٹی ڈائریکٹر، سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ (سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن)

☆ ڈاکٹر محمد شعیب اعظمی، ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن،
راجستھان آیورویدیونیورسٹی،
جودھپور، راجستھان وسابق ممبر سی سی آئی ایم منسٹری آف آیوش، نئی دہلی

☆ ڈاکٹر محمد سکندر حیات، ڈائریکٹر، یونانی سروسز، حکومت اتر پردیش

☆ ڈاکٹر محمد ادریس خاں، پرنسپل، اے اینڈ یو طبیہ کالج، نئی دہلی

☆ ڈاکٹر قمر الہدیٰ انصاری، انچارج اسلامیہ ہاسپیٹل، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ

☆ ڈاکٹر شارق ظفر، پریسیڈنٹ، ہولسٹک ہیلتھ کیئر
اینڈ ریسرچ آرگنائزیشن، مہاراشٹرا

☆ پروفیسر سید محمد اکبر رضوی، اے اینڈ یو طبیہ کالج، نئی دہلی

☆ پروفیسر یوسف جمال، اے اینڈ یو طبیہ کالج، نئی دہلی

☆ ڈاکٹر ایس پی بھٹناگر، سابق پرنسپل، علامہ اقبال یونانی میڈیکل کالج،
مظفر نگر، اتر پردیش

☆ پروفیسر رئیس الرحمٰن، سابق صلاح کار (یونانی)، وزارت آیوش، حکومت ہند

☆ ڈاکٹر سید کمال الحوت حفید مفتی لبنان خواجہ محمد درویش، تلمیذ ابن عابدین شامی،
صاحب فتاویٰ، بیروت، لبنان

☆ مولانا فداء المصطفیٰ (صاحبزادۂ صدر الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی)

☆ مولانا علی احمد سیوانی

تصنیفات (مطبوعہ):

- ☆ نمودِ سحر
- ☆ ظہورِ قدسی
- ☆ محاسبے
- ☆ معارضہ برمحاسبے کا محاسبہ
- ☆ غمزۂ چشم ہمزہ
- ☆ حدائقِ بخشش (تصحیح شدہ کا جائزہ)
- ☆ نقد ونظر (جزءاول)
- ☆ مقالاتِ شررمصباحی حصۂ دوم تذکار

ایوارڈ:

- ☆ سروس ڈاکٹرس ایوارڈ 2000/2001
  (برائے یونانی)، حکومت دہلی
  بدست وزیر اعلیٰ، دہلی
- ☆ حافظ ملّت ایوارڈ بدست سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

مرتبہ
ڈاکٹر احمد جمال
ایم ڈی (یو)